Kitab Kar

1603

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ

علمای سلف

یعنی

گزشتہ علمای اسلام کے حالات میں وہ تاریخی کتاب

جو

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

نے

ندوۃ العلماء کے چوتھے سالانہ جلسے (۱۳۱۴ھ مقام میرٹھ) میں پیش کی

اور بارِ پنجم

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء طبع ہوئی

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے - اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک مسائل تعلیم و تربیت موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے اور پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبجات متحدہ نے اپنے اجلاس دہم منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۳ء مقام علی گڑھ کے رزولیوشن ذریعہ سے پبلک کو اس کی مالی و اخلاقی اعانت پر زور سے متوجہ کیا تھا - طلبہ، اساتذہ والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی و نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ قیمت سالانہ تین روپیہ (للعہ ۳ روپے)

اڈیٹر: اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ: صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

علمای سلف

علمائے سلف

فہرست مضامین

مضمون	نمبر صفحہ

عنوانِ دوم

حق پسندی و راست گوئی

مضمون	نمبر صفحہ

عنوانِ سوم

اختلاف و اتفاق

عنوانِ چہارم

حسنِ معاش

مضمون	نمبر صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

الحمدللہ کہ رسالۂ ہذا دوبارہ چھپتا ہے۔ پہلے مطبوعہ نسخے عرصہ ہوا ختم ہو چکے۔ ارباب شوق کا تقاضا باقی ہے۔ علمای سلف کو قدیم وجدید دونوں خیال کے سرگروہوں نے اسناد قبول بخشیں۔ ایک یایو صاحب نے انگریزی ترجمہ کی اجازت حاصل کی۔ رسالے پر نظر ثانی ہوئی ہے۔ بعض مضامین کا اضافہ ہوا ہے۔ عبارت میں بھی تصرف کیا گیا ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

حبیب گنج
۱۳۳۰ھ

محمد حبیب الرحمن خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

دیباچہ طبع اوّل

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند   سماعِ بلبلِ شوریدہ رفت و حال نماند
نشانِ لالۂ ایں باغ از کہ می پرسی   برو کہ آنچہ تو دیدی بجز خیال نماند

شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلما کا اوّل اجلاس شہر کان پور میں منعقد ہوا تھا جس میں دیارِ ہند کے اکثر مشاہیر علما رونق افزا تھے۔ بزم اُن کے جمالِ کمال سے روشن تھی اور نگاہ اُن کے کمالِ جمال سے منوّر۔ اور ایک ایسا پاکیزہ منظر پیشِ نظر تھا جو تاریخِ ہندوستان میں اپنی آپ ہی

نظیر تھا۔ میری آنکھیں جب اُن نورانی شکلوں کے دیدار سے فیض یاب ہوئیں تو چشمِ بصیرت میں ایک نور پیدا ہوا جس کی روشنی میں وہ زمانہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جو فضائے عالم میں صدہا برس کی راہ طے کر چکا ہے یعنی متأخرین کا مجمع دیکھکر متقدمین کا تصور بندھا اور اُن کے حالات کے مطالعے کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ یہ شوق ہنوز دل میں قائم تھا کہ جناب مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوہ نے ایک نقشۂ مضامین شائع فرمایا جس میں چند عنوان اس غرض سے درج تھے کہ آئندہ جلسۂ مذکور کے لئے اُن پر مضامین لکھے جائیں۔ اتفاقاً ان میں ایک عنوان علمائے سلف بھی تھا۔ اس نقشے کو دیکھکر پہلی تحریک میں ایک تازہ جوش پیدا ہوا اور باوجود بے مائگی یہ سوچ کر کہ اس ذریعے سے چندے ان بزرگوں کی بھی معنوی ہمنشینی نصیب ہو جائے گی عنوانِ بالا کو میں نے لے لیا ؎

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

اس رسالے کی تیاری کے واسطے حسب ذیل کتابیں میں نے لفظ بہ لفظ پڑھیں اور اُن میں سے حالات انتخاب کئے: تذکرۃ الحفاظ از امام شمس الدین

ہی المتوفی سنہ ۴۸ھ (کشف الظنون) مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن۔
وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان از قاضی القضاۃ ابی العباس احمد
ابن خلکان المتوفی سنہ ۶۸۱ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر سنہ ۱۳۱۰ھ - نزہۃ الالباء فی
طبقات الادباء از امام ابی البرکات عبدالرحمن ابن محمد انباری المتوفی سنہ ۵۷۷ھ
(کشف الظنون) مطبوعہ مصر سنہ ۱۲۹۴ھ - عیون الانباء فی طبقات الاطباء از طبیب
عالم موفق الدین ابوالعباس احمد ابن قاسم المعروف بابن ابی اصیبعہ
المتوفی سنہ ۶۶۸ھ مطبوعہ مطبع وہبیہ مصر سنہ ۱۲۹۹ھ ۔ الشقائق النعمانیہ فی
علماء الدولۃ العثمانیہ از مولا طاشکبری زادہ رومی المتوفی سنہ ۹۶۸ھ
(العقد المنظوم) مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر سنہ ۱۳۱۰ھ - العقد المنظوم فی ذکر
افاضل الروم مطبوعہ مطبع بالا - ان کتابوں کے علاوہ جستہ جستہ ذیل کی
کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے:
مقدمہ فتح الباری للامام ابن الحجر العسقلانی المتوفی سنہ ۸۵۲ھ (کشف الظنون)
مطبوعہ مطبع انصاری دہلی سنہ ۱۳۰۲ھ - الخیرات الحسان فی مناقب الامام الاعظم
ابی حنیفۃ النعمان للمفتی احمد بن الحجر المکی المتوفی سنہ ۹۷۳ھ مطبوعہ مطبع میمنیہ مصر
سنہ ۱۳۱۱ھ - الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ للحافظ ابن حجر العسقلانی مطبوعہ مطبع

میریہ سنہ ۱۳۰۱ھ - رحلۃ ابو عبد اللہ محمد ابن عبد اللہ المعروف بابن بطوطہ[1] مطبوعہ مطبع وادی النیل مصر سنہ ۱۲۸۷ھ - کامل از علامہ ابن اثیر جزری المتوفی سنہ ۶۳۰ھ (ابن خلکان) مطبوعہ مطبع ذات التحریر مصر سنہ ۱۳۰۳ھ الملل والنحل از عبد الکریم شہرستانی مطبوعہ سنہ ۱۲۸۸ھ - بستان المحدثین از شاہ عبد العزیز صاحب مرحوم مطبوعہ مطبع منشی محمد منیر سنہ ۱۲۷۷ھ - صنّاجۃ الطرب فی تقدّمات العرب از نوفل آفندی مطبوعہ مطبع امیرکاں بیروت - کشف الاسرار شرح اصول فخر الاسلام بزدوی از امام عبد العزیز بخاری المتوفی سنہ ۷۳۰ھ مطبوعہ مطبع صحافیہ عثمانیہ قسطنطنیہ سنہ ۱۳۰۸ھ - اس فہرست کے پیش کرنے سے اپنا بلاغ نظر جتانا مقصود نہیں بلکہ یہ اظہار مطلوب ہی کہ یہ کتاب کس قسم کے ماخذوں سے صورت پذیر ہوئی ہی - اس موقع پر اتنی گزارش کی اور جسارت کی جاتی ہی کہ اس ناچیز تحریر میں جو بحث حالات و واقعات سے کی گئی ہی یا جو نتیجہ اُن سے نکالا گیا ہی وہ مورخانہ حیثیت سے ہی نہ مفتیانہ یا متکلّمانہ حیثیت سے اور اس سے مقصود گزشتہ علمائے اہل اسلام کے حالات کا لکھنا ہی نہ کسی دینی مسائلے کا فیصل اور طے کرنا - حوالہ واقعات لکھتے وقت حسب ذیل

---

[1] ابن بطوطہ کی سیاحت کا آغاز سنہ ۷۲۵ھ میں ہوا اور اختتام سنہ ۷۵۶ھ میں

علامتوں سے کام لیا گیا ہے۔

تذ، تذکرۃ الحفاظ۔ ابن، ابن خلکان۔ شق، شقائق نعمانیہ۔ عیون، عیون الانباء۔ نزہتہ، نزہتہ الالباء۔ مقدمہ، مقدمہ فتح الباری ج، جلد۔ ص، صفحہ۔

شقائق نعمانیہ کی تقسیم جلدوں پر اس کے مصنف نے نہیں کی ہے۔ مگر چونکہ یہ کتاب تاریخ ابن خلکان کی دونوں جلدوں کے حاشیے پر درج ہے اور دونوں جلدوں کے صفحوں کا شمار جدا جدا ہے اس لئے حاشیے کی کتاب کی بھی تقسیم کرنی پڑی۔

ہر واقعے کا حوالہ بقید جلد و صفحہ کتاب اس کتاب کے ہر صفحے کے نیچے لکھ دیا گیا ہے اور اس طرح میں نے اپنا وہ فرض ادا کر دیا ہے جو بحیثیت ناقل میرے ذمے تھا۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللهِ العَلِی العَظِیم

خادم طلبا
محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی

بھیکن پور۔ ضلع علی گڑھ
۱۹ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ

عُنوانِ اوّل

طلبِ علم

علمائے سلف کے جن حالات سے ہم بحث کرنا چاہتے ہیں ان میں طلبِ علم کو سب سے اوّل ہم نے قایم کیا ہے۔ اہل علم کی زندگی کے مختلف مدارج ہیں۔ یہ منزل سب سے پہلی ہے اور یہ تقدم نہ صرف بلحاظ زمانے کے ہی بلکہ باعتبار اہمیت اور شان کے بھی۔ کیونکہ یہی وہ منزل ہی جو اس بات کا فیصلہ کر دیتی ہی کہ کون منزلِ مقصود تک پہونچیگا اور کون حرمان نصیب ہوگا۔ ایک عالم کا ذکر آپ آگے پڑھینگے کہ ایک شب اپنے دو طالب علموں کو اُنھوں نے دیکھا کہ ایک تکیہ کا سہارا لئے کتاب دیکھ رہا تھا دوسرا دو زانو مُستعد بیٹھا مطالعے میں مشغول تھا اور وقتاً فوقتاً کچھ لکھتا بھی جاتا تھا۔ جوہر شناس اُستاد نے یہ ماجرا دیکھ کر اوّل کی نسبت کہا کہ اِنَّهٗ لَا يَبْلُغُ دَرَجَةَ الْفَضْلِ[1] دوسرے کی بابت فرمایا کہ سَيُحَصِّلُ الفضلَ ويكونُ لَهٗ شَانٌ فِي الْعِلْمِ[2] تجربے نے ثابت کیا کہ پیشین گوئی بالکل سچّی تھی۔ پس جو منزل اس طرح آیندہ زندگی کا فیصلہ کر دینے والی ہو اُس کے مہتم بالشان ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہی۔ اس منزل کو اگر صرف اوّل منزل کہہ کر چھوڑ دیا جائے تو ایک پہلو اُس کا بیان ہوگا۔ جس طرح یہ منزل سب سے اوّل ہی اُسی طرح سب سے آخر ہی بلکہ یہ کہنا قطعاً مبالغے سے مبرّا ہے کہ باکمال علما کی زندگی میں اوّل سے آخر تک یہ منزل ختم نہیں ہوتی۔ آپ آگے

---

[1] اس کو فضیلت کا رتبہ حاصل نہ ہوگا   [2] یہ شاندار فاضل ہوگا

کے صفحوں میں بہت سے واقعے اس دعوے کی تائید میں پائینگے۔ اہل کمال نوّے برس کی عمر میں بھی طالب علم تھے اور جب اُن کی رُوح سکرات کے تلاطم میں تھی اُن کا دل و دماغ خدمتِ علم میں مصروف تھا

ـــہ تا بشیر اندر رود شد و باجان بدر شود　　　مہر تو در وجودم و عشقِ تو در سرم

شیخ الاسلام انصاری نے فرمایا ہے کہ هٰذَا الشَّانُ شَانُ مَنْ لَيْسَ لَهٗ شَانٌ سِوٰى هٰذَا الشَّانِ۔ یعنی طلب علم اُن جواں مردوں کا کام ہے جن کو یہی دُھن ہو۔ طالب علمی کے مختلف درجے ہیں پہلا دَور مکتب یا مدرسے میں اُستاد کی زیر نگرانی ختم ہوتا ہے اور فی الواقع اُس کو بنیادِ کمال سے زیادہ کوئی لقب نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی شخص ایک عالی شان عمارت کا منصوبہ دماغ میں قایم کرے اور اُس کی بنیاد بھر کر سطح زمین سے کچھ بلند کر دے اور اتنی محنت کے بعدہٗ یہ خیال کرے کہ میں مکان بنا چکا تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالی شان عمارت بن چکی۔ چند روز میں ہوا اور بارش کے صدمے اتنی بنیاد کو بھی نسیاً منسیا کر دینگے اور اس کے بانی کی پست ہمتی کی ایک عبرت ناک یادگار قایم رہ جائیگی بجنسہ یہی حال اُن ہونہار طالب علموں کا ہے جو مدرسہ چھوڑ کر یہ سمجھ لیں کہ ہم عالم بن چکے۔ یہ طلبہ بھی اپنی ہونہاری کا خون کر کے اپنے اُستاد اور دوستوں کے دلوں کو حسرت کا داغ دینگے۔ دوسرا دَور طالب علمی کا مدرسے کے بعد شروع ہوتا ہے جس میں انسان خود شاگرد بنتا ہے اور خود اُستاد ـــہ

مُعلّم کیست عشق و کنجِ خاموشی دبستانش　　　سبق نادانی و دانا دلم طفلِ سبق خوانش

ز ہر کس تا بداین اُستاد و شاگردی نہ ہر کوہے　　　بدخشاں باشد ہر سنگریزہ لعلِ رخشانش

اس دَور کی انتہا وہ ہے جو بلند خیال ابن العلا نے مقرر کی ہے یعنی مادامت الحیٰوۃ تحسن[۱] یہی دَور کمال کا دَور ہے۔ پس طالب علمی اور کمال گویا ایک ہی ہیں اور اسی لحاظ سے ہم نے

---

[۱] جب تک زندگی بخیر رہے

طلب علم کو اوّل اور آخر منزل قرار دیا ہے۔

جن جواں مردوں نے میدانِ طلبِ علم کو طے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ راہ کیسی معرکہ خیز اور صبر آزما ہے۔ کہیں افلاس کا مردم خوار دیو اپنی منحوس صورت دکھلاتا ہے اور قوتِ لایموت کے حاصل ہونے کی بھی کوئی شکل نظر نہیں آتی کبھی جڑی بوٹی کے پتّوں پر بسر کرنی ہوتی ہے۔ اور کبھی نان بائی کی دُکان پر صرف بوئے طعام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ کہیں محنت و مشقت سے دل گھبراتا ہے اور چھکّے چھوٹتے ہیں۔ کسی کو ناز و نعمت کے کرشمے اپنی طرف کھینچتے کسی کی نفسانی خواہشیں دست بگریباں ہوتی ہیں۔ غرض ایک ہنگامۂ بلاخیز سے سامنا کرنا پڑتا ہے جن ارادوں میں ذرا بھی قوت کی کمی ہوتی ہے وہ ان معرکوں کے مقابلے میں پست ہو جاتے ہیں اور ان کی زبانِ حال پر لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ کا مضمون ہوتا ہے۔ لیکن سچی طلب اپنا راستہ صاف کر کے طالب کو مطلوب تک پہونچا دیتی ہے جس قدر دقت اور صعوبت پیش آتی ہے ان بہادر طالبوں کے عزم زیادہ مستحکم اور حوصلے زیادہ بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اگر حوصلوں میں وسعت اور ارادوں میں استحکام نہ ہوتا تو اہل اسلام کو شیخ الاسلام بقی بن مخلد، امام بخاری اور حکیم ابونصر فارابی نصیب نہ ہوتے۔ کیا چقندر کے پتّے اور جنگل کی گھاس کھا کر اور شب کو پاسبانوں کی لالٹینوں سے مطالعہ کر کے امام اور حکیم بن جانا آسان ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ کون سی قوت تھی جس نے علی بن عاصم عراقی اور ابن سنجر کو ناز و نعمت کے آغوش سے چھین کر راہِ طلب میں سرگردان کر دیا اور اتنا پھرایا کہ ایک کو مُسندِ عراق اور دوسرے کو حافظ کبیر بنا کر چھوڑا۔ بے شک یہ طلب صادق ہی کا کرشمہ تھا۔ اتنی تمہید کے بعد ناظرین بآسانی ذہن نشین کر سکیں گے کہ ہم علمائے سلف کی طلب علم کی نسبت کس کس پہلو پر بحث کرنے والے ہیں اور سچی طلب کا معیار ہمارے پاس کیا ہے۔

افلاس | انسان کا حوصلہ پست کرنے والی اور ہمت کی کمر توڑ دینے والی دنیا میں کوئی چیز

غالباً افلاس سے بڑھ کر نہیں ہے۔ مفلسی میں پھنس کر آدمی عزم کا استحکام اور ارادے کی استواری بالکل کھو بیٹھتا ہے۔ اور دل و دماغ کی شگفتگی جو تمام بلند خیالیوں کا سرچشمہ ہے قطعاً معدوم ہو جاتی ہے۔ اگر ایک سرسبز چمن کی سیرابی کے سارے ذرائع مسدود کر دیئے جائیں تو وہ مایۂ بہجت سراپا وحشت بن جائیگا! اور ظاہر ہے کہ جس چمن کے نشو و نما یافتہ گلبن جل کر ہیزم خشک ہو جائیں اُس میں تازہ نوباووں کے اُگنے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ بعینہٖ یہی مصیبت افلاس کے ہاتھوں انسانی دل و دماغ پر نازل ہوتی ہے۔ مفلسی نہ صرف موجودہ خیالات کا ستیاناس کرتی ہے بلکہ آیندہ حوصلوں اور اُمنگوں کا پیدا ہونا بھی بند کر دیتی ہے ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج　　　احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

خدا جانے کتنی قابلیتوں کا خون اس مردم خوار دیو کی گردن پر ہے اور کس قدر استعدادیں اس بے درد کے ہاتوں ضائع ہوئی ہیں۔ جو بلند ہمّت نوجوان اپنے بڑھتے ہوئے ارادوں میں افلاس کے پھندے میں پھنس کر مایوسی کے ساتھ بے دست و پا رہ جاتے ہیں اُن کی مثال بجنسہ ایسی ہے کہ ایک سیاہ ہرن اپنی طاقت اور قوت کے زعم میں اکڑا چلا جا رہا ہے میدان کی وسعت اس کے دل میں اُمنگیں پیدا کر رہی ہے اور قدم قدم پر اُس کی چال بڑھتی جاتی ہے ناگاہ وہ صیاد کے مضبوط پھندوں میں (جو دُور تک پھیلے ہوئے ہیں) پھنس کر گر پڑا۔ اب وہ جس قدر اپنی قوت صرف کرتا ہے اُتنی ہی اُن پھندوں کی گرفت سخت ہوتی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے یہ منظر ملاحظہ کیا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ جنگل کا آزاد منش پہلوان کیسا اُن پھندوں میں پڑ کر اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے۔ آہ اے افلاس! تو آج تو مسلمانوں کے حوصلوں پر ہمیشہ سے زیادہ بیداد کر رہا ہے۔ جس قوم میں حوصلوں کا قحط اور ہمّت کا کال ہو اُس میں اگر کچھ اولوالعزم جویائے کمال نکل آئیں تو اُن کو تو ہیں کر سکتے۔ ہائے یہ کیسا ظلم ہے۔ لیکن تجھ کو یاد ہوگا کہ تیرا

زور آج کل کی طرح ہمیشہ ہماری ہمتوں پر غالب نہیں رہا۔

کیا تجھ کو یاد نہیں ہے کہ جب حافظ الحدیث حجاج بغدادی شبابہ کے یہاں تحصیل علم کو جانے لگے تو اُن کی مقدرت کی کل کائنات یہ تھی کہ اُن کی دل سوز والدہ نے سو کلچے پکا دیئے تھے جن کو وہ ایک گھڑے میں بھر کر ساتھ لے گئے۔ روٹیاں مہربان ماں نے پکا دی تھیں سالن ہونہار اور دلیر فرزند نے خود تجویز کر لیا اور اتنا کثیر و لطیف کہ آج تک صدہا برس گزرنے کے بعد بھی ویسا ہی تر و تازہ موجود ہے وہ کیا ہے دجلے کا پانی حجاج ہر روز ایک روٹی دجلے کے پانی میں بھگو کر کھا لیتے اور اُستاد سے پڑھتے جب روز وہ روٹیاں ختم ہو گئیں اُن کو اُستاد کا فیض بخش دروازہ چھوڑنا پڑا[۱۵۱]۔ شیخ الاسلام بقی بن مخلد اس سے بھی زیادہ مؤثر حکایت بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس پر ایام طالب علمی میں اتنا سخت زمانہ گزرتا تھا کہ بے مائیگی کی وجہ سے چقندر کے پتے کھا کھا کر بسر کرتا[۱۵۲]۔ پتے کھانا کچھ زیادہ عجیب بات نہیں۔ بھوک وہ بلا ہے کہ لختِ جگر بچوں کے کباب ماں باپ کو کھلا کر چھوڑتی ہے۔ قابلِ تحسین و ہزار آفریں یہ امر ہے کہ جس افلاس نے چقندر کے پتے کھانے پر مجبور کیا اُس میں اتنی قوت نہ تھی کہ علمی شوق پر غالب آتا اور اُس دلیر طالب علم کی ہمت توڑ دیتا۔ یاد ہے ابن بجیر امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک سفر میں تہی دستی نے اتنا مجبور کیا کہ تین دن برابر انھوں نے جنگل کی بوٹیاں کھائیں[۱۵۳]۔ ابن المقری۔ ابو الشیخ۔ اور طبرانی یہ تینوں شیخ عصر ایک زمانہ میں مدینہ طیبہ میں طالب علمی کرتے تھے۔ ایک بار اُن پر ایسا وقت آیا کہ خرچ کی قلت نے بہت پریشان کیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ روزے پر روزہ رکھا۔ بھوک نے جب بہت مضطرب کیا تو انھوں نے حضرت سرورِ کائنات کا وسیلہ ڈھونڈا اور سب کے سب مل کر آستانۂ پاک پر گدایانہ حاضر ہوئے اور

---

[۱۵۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۰ [۱۵۲] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۴ [۱۵۳] مقدمہ صفحہ ۵۶۶

صدا دی کہ "یا رسول اللہ الجوع"۔ اس کے بعد طبرانی تو وہیں بیٹھ گئے اور کہا کہ یا موت آگئی یا روزی۔ ابن مقری اور ابوالشیخ لوٹ کر فرودگاہ پر چلے آئے۔ وہ صدا خالی کب جاتی کچھ عرصے کے بعد دروازۂ مکان پر کسی نے دستک دی دروازہ جو کھولا تو دیکھا کہ ایک عالی دودمان علوی مع دو غلاموں کے تشریف فرما ہیں اور غلاموں کے سروں پر بہت سا سامان ہے۔ اُن کو دیکھ کر علوی نے کہا کہ آپ لوگوں نے میری شکایت حضور نبوی میں کی۔ خواب میں آپ نے مجھ سے فرمایا ہے کہ تمہارے پاس کچھ پہنچا دوں۔ چنانچہ یہ حاضر ہے۔[1]

شیخ الفقہا امام برقانی جب اسفرائن پڑھنے گئے تو اُن کے پاس تین اشرفیاں اور ایک درہم تھا۔ سوء اتفاق سے اشرفیاں راہ میں گم ہوگئیں درہم باقی رہ گیا۔ اسفرائن پہونچ کر وہ درہم ایک نان بائی کے یہاں جمع کر دیا۔ ہر روز اُس سے دو روٹیاں لے لیتے۔ اور احمد بن بشر کے یہاں سے ایک جز کتاب کا لاکر شام تک نقل کرتے اور شام کو نقل شدہ جز واپس پہونچا دیتے تیس جز نقل ہوئے تھے کہ درہم ختم ہوگیا اور انھوں نے مجبور ہوکر اسفرائن سے سفر اختیار کیا۔[2] امام ابو علی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہونچی اور ضعف نے لکھنے سے معذور کر دیا جب بھوک کی اذیت برداشت نہ ہوسکی تو نان بائی کی دکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ کھانے کی خوشبو سے ہی کچھ تقویت طبیعت کو پہونچا لیں۔[3]

فن حدیث کے عالی مرتبہ امام ابو حاتم رازی اپنا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں زمانہ طالب علمی میں چودہ برس بصرے رہا۔ ایک مرتبہ تنگ دستی کی یہ نوبت پہنچی کہ کپڑے تک بیچ کھائے جب کپڑے بھی نہ رہے تو دو دن بھوکا رہا آخر ایک رفیق سے اظہار حال کیا خوش قسمتی سے اُس کے پاس ایک اشرفی تھی نصف اُس نے مجھ کو دے دی۔[4] امام ابن جریر طبری زندگی خرچ

۱؎ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳ ۲؎ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۷۵ ۳؎ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۷۱ ۴؎ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۴

کے سبب سے اپنے کرتے کی دونوں آستینیں بیچ کر کھائی تھیں[1]۔ ابن ابی داؤد جب کوفے طالب علمی کرنے گئے تو صرف ایک درہم پاس تھا اُس کا باقلا خریدا۔ باقلا کھاتے اور طالب علمی کرتے تھے[2]۔ شیخ الاسلام ابو العلاء ہمدانی کو بغداد میں کسی نے اس حال میں دیکھا کہ رات کو مسجد کے چراغ کی روشنی میں جو بلندی پر تھا کھڑے کھڑے لکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر اُن کو روغن خریدنے کی مقدرت ہوتی تو یہ تکلیف وصعوبت کیوں گوارا کرتے[3]۔ حکیم ابو نصر فارابی جس کا ایک عالم میں شہرہ ہے اس کی نسبت بہت کم لوگ جانتے ہونگے کہ وہ عہد طالب علمی میں تہی دستی کی بدولت چراغ کا تیل خریدنے سے بھی معذور تھا۔ تاہم اُس کا شوق بیکار رہنے والا نہ تھا۔ رات کو پاسبانوں کی قندیلوں سے کام لیتا اور اُن کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ کیا کرتا۔ اسی تنگ حالی میں وہ علمی ترقی کی کہ سارے جہان میں اپنا نام روشن کر دیا[4]۔

سفر آج کل مسلمانوں کی علمی دنیا میں جو افسردگی چھائی ہوئی ہے اُس پر لحاظ کرکے یہ عنوان نرالا معلوم ہوگا۔ موجودہ حالت دیکھ کر مشکل سے باور آسکتا ہے کہ کبھی ہم میں بھی ایسے لوگ تھے جو علم کی دُھن میں برّاعظم اور سمندر کاٹ کر ڈالنا ایک بات سمجھتے تھے جو ایک کتاب کی خاطر صدہا میل پیادہ پا جاتے اور جو صرف نباتات کے حالات تحقیق کرنے ملکوں ملکوں پھرتے اگر اُن کے دلوں میں وہ جوش اور دماغوں میں وہ ولولہ نہ ہوتا تو ہم کو ابن بیطار اور سید شریف نصیب نہ ہوتے، ابو حاتم رازی اور حافظ ابن طاہر کے کارنامے ہمارے قومی خیالوں میں فخر نہ پیدا کرتے۔ علمائے سلف کے حالات دیکھنے سے عیاں ہوتا ہے کہ اُن بزرگوں کے دل میں شوق علم کی ایک ایسی بیتابی تھی جو اُن کو کسی شہر یا ملک میں قرار نہیں لینے دیتی تھی اور ایک سمندر سے دوسرے سمندر میں اور ایک برّاعظم سے دوسرے برّاعظم میں لئے پھرتی۔ اگر آج ہمارے دلوں

---

[1] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۸۰ [2] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۳۲۹ [3] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۱۲۰ [4] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۱۴۴

میں اُس کا ایک شمہ بھی ہوتا تو ہم علم و فن میں ہر قوم و ملت کے مقابلے میں پست نہ ہوتے۔ اور حق یہ ہے کہ جب ہمارے ارادے پست ہماری ہمتیں قاصر ہو رہی ہیں تو ہمارا اسلاف کے کارناموں پر اترانا ان بزرگوں کے نام روشن کو دھبہ لگانا ہے اور اپنے آپ کو حقیر کرنا جس ملت کے پیشوا کا یہ مقولہ ہو کہ اطلبوا العلم ولو بالصین اُس ملت کے افراد کو سفر کا نام سن کر لرزہ چڑھے ع ھٰذا العمری فی القیاس بدیع اور جس قوم کے بچے بچے کے کان اس حکیمانہ مقولے سے آشنا ہوں کہ ؎

تا بدکان حسانہ در گروی   ہرگز اے خام آدمی نہ شوی

وہ گھر سے باہر قدم نہ نکالے ھٰذا الشیٔ عجاب۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے لفظ "رحلت" بجائے خود ایک مقدس لفظ معلوم ہونے لگتا ہے حیف ایک وہ گروہ قدسی تھا کہ جس نے سیاحت کرتے کرتے خود لفظ میں تقدس پیدا کر دیا اور ایک ہم ہیں کہ گھر میں گھسے گھسے سارے عالم کے یہ ذہن نشین کر دیا کہ "مسلمان" اور "سفر" ان دونوں لفظوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یہ قصہ دراز ہے اور ہم کو دوسری داستان بیان کرنی ہے اس لئے اس سے قطع نظر کرکے ہم اپنے مدعا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سب سے اول ہم اُن سیاحتوں کا ذکر کرینگے جو علمائے سلف نے احادیث نبویہ کے حاصل کرنے کے واسطے کیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی علمی دنیا میں سفر کا رواج ابتداءً اسی پاک فن کی بدولت ہوا ہے۔ محدثین کے سفر کا حال بیان کرنے کے بعد ہم اُن علما کا حال لکھیں گے جنھوں نے حدیث کے سوا اور علوم کے حاصل اور دقائق علمیہ کے حل کرنے کے واسطے دور و دراز ممالک کے سفر اختیار کئے تھے۔

امام مالک نے حضرت سعید بن المسیب تابعی سے روایت کی ہے کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پیادہ پا چلا ہوں[1]۔ امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین۔ خراسان۔ عراق

---

[1] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۴۰

شام اور مصر کا سفر کیا تھا[51] صحیح بخاری کے مصنف امام بخاری نے چودہ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی۔ اُن کی والدہ اور خواہر سفر میں نگراں تھیں۔ بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک اُس عالی مقام امام[52] کے سفر کی فہرست میں ہیں۔

امام ابو حاتم رازی نے اپنی سرگزشت خود بیان کی ہے کہ میں نے تین ہزار فرسخ سے زیادہ مسافت پیادہ پاطے کی ہے۔ (ایک فرسخ تین میل کا ہوتا ہے لہٰذا اُن کی پیادہ روی نو ہزار میل سے زائد ہوئی) یہ اُن کی سیاحت کی انتہا نہیں بلکہ شمار کی حد ہے۔ کیونکہ امام ممدوح فرماتے ہیں کہ اُس کے بعد میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا۔[53]

امام فسوی نے تیس برس سفر میں بسر کر دیئے۔[54] شیخ الاسلام بقی ابن مخلّد نے دو سو اسّی شیوخ سے حدیث روایت کی ہے۔ خود اُنھوں نے فرمایا ہے کہ میں جس شیخ کے پاس گیا پیادہ پا گیا۔[55] محدّث اندلس (اسپین) ابن حیون نے حدیث اُندلس۔ عراق۔ حجاز او یمن کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی۔[56] یہ معلوم نہیں کہ اُنھوں نے یہ سفر کس راستے سے کیا لیکن نقشے کے معائنے سے واضح ہوتا ہے کہ اگر یہ سفر دریا کے راستے سے کیا گیا تو پورا بحیرۂ روم اور تمام و کمال بحر احمر اُنھوں نے طے کیا ہوگا! ور اگر خشکی میں کیا ہوگا تو طنجے سے لے کر سویز تک سارا برّاعظم افریقہ اُنھوں نے پیدل سیر کیا ہوگا۔ اُس کے بعد اگر براہِ راست یمن آئے تو کل بحر احمر میں سفر کر کے یمن پہونچے ہونگے اور اگر بیت المقدس وغیرہ کی جانب چلے گئے ہونگے تو شام و حجاز و عراق میں پھر کر اُنھوں نے منزل علمی ختم کی ہوگی۔ مگر چونکہ اُن کے سلسلہ سفر میں مصر کا ذکر نہیں اس لئے غالباً بحری راستے سے یہ سفر ہوا ہے۔ کیونکہ خشکی کے راستے میں ضرور مصر پڑتا

---

[51] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۴ [52] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۴ [53] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۴۷

[54] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۲۰ [55] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۵ [56] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۴

اور یہ ناممکن سا معلوم ہوتا ہی کہ اُس زمانے میں کوئی طالب علم مصر جاتا اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ نہ کرتا۔ اسپین سے یمن براہِ راست ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ ہی۔

ابن المقری بیان فرماتے ہیں کہ میں نے صرف ایک نسخۂ ابن فضالہ کی خاطر ستر منزل کا سفر کیا تھا۔ اُس نسخے کی ظاہری حیثیت یہ ہی کہ اگر کسی نان بائی کو دیا جائے تو وہ ایک روٹی بھی اُس کے عوض میں دینا گوارا نہ کریگا۔ (ایک منزل معمولی طور پر بارہ میل کی قرار دی گئی ہی پس اگلے علما آٹھ سو چالیس میل ایک ایک کتاب کی خاطر طے کر ڈالتے تھے) اس کے علاوہ امام موصوف نے چار مرتبہ مشرق (ممالک ایشیا) اور مغرب (ممالک افریقہ و اسپین) کا سفر کیا تھا اور دس دفعہ بیت المقدس گئے تھے[۱]۔ حافظ ابن مفرج نے سعید بن الاعرابی سے حدیث کی سماعت مکۂ مکرمہ میں کی۔ ابن اشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبغ سے قرطبہ (کارڈوا ملک اسپین) میں۔ ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمد سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے جدہ، صنعا اور بیت المقدس میں[۲]۔ یہ مقامات اگر نقشے میں دیکھے جائیں تو تین بڑا عظموں میں بکھرے ہوئے ملیں گے۔ قرطبہ یورپ میں۔ مصر افریقہ میں۔ طرابلس سے مراد اگر طرابلس شام ہی تو ایشیا میں، ہی ورنہ افریقہ میں باقی مقامات ایشیا میں۔ عبرت کا مقام ہی کہ جو مقامات ایک زمانے میں ہمارے پاک مذہبی علوم کے سرچشمہ تھے وہاں آج کوئی مذہب اسلام کا ماننے والا تو بڑی بات ہے جاننے والا بھی نہیں۔ اسپین میں اگر کوئی شخص جا کر سیاحت کرے تو کیا اُس کے گمان میں بھی آ سکتا ہی کہ دنیاے اسلام کے نامور عالم اور مشائخ بیسیوں سیکڑوں ہزاروں اُس سرزمین سے اُٹھے تھے۔ ابن عبد البر حمیدی، شیخ اکبر کہاں کے تھے؟ اِسی اسپین کے جو آج یورپ میں مل کر بھولے ہوئے غلام کی طرح اپنے قدیم آقا کی صورت سے بھی بیزار ہی۔ اگر ہم عبرت حاصل

---

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۸۳ [۲] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۱۴

کریں تو ہماری آنکھیں کھولنے کے واسطے یہ واقعہ کم نہیں کہ مادرزاد نابینا حافظ الحدیث ابو العباس رازی اپنے نبی پاک کے اقوال و افعال کی شیفتگی میں بلخ[1]، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر کرتے پھرتے تھے[2]۔ امام ممدوح باوجودیکہ دنیا کے دیکھنے سے محروم تھے تاہم اُن کی بھی سوانح عمری باب سیاحت سے خالی نہیں۔ حیف ہم پر جو خدا کی دی ہوئی ایک چھوڑ دو دو آنکھیں رکھتے ہیں عالم کو دیکھتے ہیں اور پھر بھی آنکھیں بند ہیں۔ حافظ ولید سرقسطی (باشندہ سراگوسا ملک اسپین) کے حالات میں امام ذہبی فرماتے ہیں رحل من اقصی الاندلس الی خراسان یعنی انھوں نے انتہائے اندلس سے خراسان تک سفر کیا۔ حافظ ممدوح سراگوسا میں پیدا ہوئے تھے اور سرزمین دینور (واقع ایران) میں آرام کر رہے ہیں[3]۔ امام ابو زکریا کے سفر کا آغاز بخارا سے اور انجام قیروان (واقع افریقہ) پر ہوا[4]۔

حافظ ابن طاہر مقدسی نے جتنے سفر طلب حدیث میں کئے اُن میں کبھی انھوں نے کسی سواری کا سہارا نہیں لیا۔ سواری اور باربرداری دونوں کا کام وہ اپنے ہی نفس سے لیتے تھے۔ سفر پیادہ پا کرتے تھے اور کتابوں کا پشتارہ پشت پر ہوتا تھا۔ مشقت پیادہ روی کبھی کبھی یہ رنگ لاتی کہ پیشاب میں خون آنے لگتا۔ اسی جفاکشی سے جو سیاحت حافظ ممدوح نے کی اُس میں حسب ذیل مقامات منجملہ اور مقاموں کے تھے۔ بغداد، مکہ مکرمہ، جزیرہ تنیس[5] (واقع بحیرۂ روم)، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، رحبہ[6]، لوقان، مدینہ طیبہ، نہاوند، ہمدان، واسط، ساوہ، اسدآباد، انبار، اسفرائن، آمل، اہواز، بسطام، خسروجرد، جرجان، آمد، استرآباد، بوسنج، بصرہ، دینور[7]، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ[8]۔

---

[1] بلخ سے بغداد براہ بخارا ۱۳۶۵ میل ہیں [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۳۳ [3] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۳۳ و ۲۸۰ و ۲۸۱
[4] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۵۱ [5] بکسر تائے مثناۃ وکسرۂ نون مشدد و سکون یائے تحتانی و سین مہملہ
[6] بضم رائے مہملہ و سکون حائے مہملہ [7] بکسر دال مہملہ و فتح نون [8] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۴۰

حافظ ابو عبداللہ اصفہانی ایک مرتبہ اپنے مقامات رحلت کی تفصیل بیان کرنے لگے کہ میں حدیث حاصل کرنے گیا ہوں طوس، ہرات، بلخ، بخارا، سمرقند، کرمان، نیشاپور، جرجان، غرض اسی طرح وہ نام لیتے گئے یہاں تک کہ ایک سو بیس مقامات کے نام لے ڈالے[51] میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ایک سو بیس مقاموں کے نام مسلسل لئے جائیں تو سننے والے گھبرا جائیںگے۔ آفریں اس باہمت جواں مرد پر جو اتنے مقاموں کا سفر کرتے کرتے نہیں گھبرایا۔

واقعہ ذیل اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ کیسا شوق علم کے واسطے سفر کرنے کا اُن دنوں مسلمانوں کے دلوں میں تھا۔ امام اسمٰعیل نے جب محمد بن ایوب رازی کی خبر وفات سنی تو رو دیئے چیخے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سر پر خاک ڈالی۔ اُن کی پریشانی دیکھ کر سارے گھر والے جمع ہوگئے اور پوچھا خیر ہے کیا حال ہے۔ انھوں نے دل گیر ہو کر کہا کہ تم لوگ مجھ کو سفر کرنے سے روکتے رہے آخر محمد بن ایوب وفات پا گئے اب میں اُن کو کہاں پاؤں گا۔ گھر والوں نے اُن کو تسلّی دی اور انتظام کر کے ماموں کے ہمراہ شہر نسا کو ایک دوسرے شیخ وقت ابن سفیان کی خدمت میں بھیجدیا۔ اسمٰعیل کا سن اُس وقت سترہ برس کا تھا تاہم اتنی عمر تک بھی گھر میں بیٹھا رہنا انھوں نے مصیبت خیال کیا[52]۔

اسی کے قریب قریب امام ابوسعد کا واقعہ ہے کہ جب وہ سولہ برس کی عمر میں سفر کرکے حافظ ابو نصر زینبی سے پڑھنے بغداد گئے تو وہاں پہنچ کر ان کے وفات پانے کی خبر سنی۔ اس جگر خراش خبر نے ایسا صدمہ ابوسعد کے دل کو پہنچایا کہ وہ چیخ کر روئے طمانچوں سے منھ لال کرلیا اور حسرت سے کہا کہ من این لی علی بن الجعد عن شعبۃ[53]۔

امام عزالدین مقدسی چودہ برس کی عمر میں تحصیل علم کے واسطے بغداد پہنچ گئے تھے[54]۔

---

[51] تذ-ج ۴-صفحہ ۵۲ [52] تذ-ج ۳-صفحہ ۱۶۱ [53] تذ-ج ۴ صفحہ ۰ [54] تذ-ج ۴-صفحہ ۱۹۳

حافظ ابو الخطاب اندلسی نے تحصیل علم کی غرض سے اولاً تمام ملک اسپین میں سفر کیا وہاں سے فارغ ہو کر مراکش (مراکو) آئے۔ مراکش اور دیگر ممالک حبش کی سیاحت کے بعد مصر پہونچے اور مصر کے بعد شام، عراق عرب، عراق عجم اور خراسان کا سفر کیا۔ اور اس طرح تین برّاعظم اُن کے ملک پیما قدموں کے نیچے سے نکل گئے۔[1]

امام ابو الولید باجی شہر باجہ میں (جو اشبیلیہ کے متصل اسپین میں واقع تھا) پیدا ہوئے تھے۔ علوم عقلیہ پڑھنے کے واسطے سفر کر کے موصل آئے اور وہاں ابو جعفر سمنانی سے ان علوم کو حاصل کیا۔[2]

فنِ ادب کے مشہور امام کسائی ایک مجلس علما میں اکثر جایا کرتے تھے ایک دن جو وہاں پہونچے تو بہت خستہ ہو گئے تھے۔ اپنی خستگی ظاہر کرنے کے لئے انھوں نے کہا "عیّیت" (بالتشدید) یعنی میں تھک گیا۔ اہلِ مجلس نے ٹوکا کہ تم غلط لفظ استعمال کر رہے ہو انھوں نے وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ اگر تمہاری مراد ماندگی ہو تو اعییت کہو اور اگر درماندگی کا اظہار مقصود ہو تو لفظ عییت (بالتخفیف) استعمال کرو۔ کسائی کے دل پر اس اعتراض سے ایک چوٹ لگی اور فوراً مجلس سے باہر نکل آئے اور یہ تہیّہ کر لیا کہ وہ فن سیکھنا چاہیئے جس سے پھر آیندہ ایسی خفت کسی محفل میں حاصل نہ ہو۔ یہ عزم کر کے فنِ ادب کے اُستاد یگانہ خلیل بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پڑھنا شروع کیا۔ مگر جو رتبۂ امامت اُن کو اس فن میں ملنے والا تھا اُس کے حصول کے لئے خلیل کی مجلس کافی نہ تھی۔ ایک دن ایک بدوی نے اُن پر یہ طعن کیا کہ تم کانِ ادب بنی تمیم اور بنی اسد کو چھوڑ کر عربیت حاصل کرنے بصرے آئے ہو۔ یہ چبھتا ہوا فقرہ کسائی کے دل میں اثر کر گیا اور اپنے علاّمہ اُستاد سے کسی موقعے پر انھوں

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۸۱ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۳۷۱

نے پوچھا کہ آپ نے فنِ ادب کہاں سیکھا۔ اُستاد نے جواب دیا کہ حجاز[1]، تہامہ اور نجد کے جنگلوں میں۔ یہ سُن کر کسائی کے سر میں تازہ سودا پیدا ہوا اور شہر چھوڑ کر صحرا کی راہ لی اور قبیلہ در قبیلہ اتنے پھرے کہ اُس فن کے امام بن گئے جس کے نہ جاننے سے شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ کیا مبارک تھی کسائی کی غلطی جس نے لاکھوں کروروں آدمیوں کو صحیح عربی پر قادر کر دیا! اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے مسلمانوں کی علمی حمیت کیسی حساس تھی جس کو جوش میں لانے کے لئے ادنیٰ تحریک کافی ہوتی تھی۔ شاید بیجا نہ ہوگا اگر ہم اس کی اور دو ایک مثالیں ہدیہ ناظرین کریں! ایک دوسرے امامِ ادب سیبویہ کا قصہ ہے کہ ابتدائے طالب علمی میں وہ فقہ اور حدیث پڑھا کرتے تھے۔ نحو سے اُس وقت تک چنداں مناسبت نہ تھی۔ اُس زمانے میں وہ حماد بن سلمہ کے مستملی[2] بھی تھے۔ ایک روز کسی حدیث کی روایت میں حماد نے الفاظ لیس ابا الدرداء املا کئے۔ سیبویہ نے اُن کو ادا کرتے وقت لیس ابو الدرداء سامعین کو سنایا۔ شیخ نے کہا کہ غلط لفظ مت بتاؤ لیس ابا الدرداء کہو۔ اس گرفت سے سیبویہ کو نہایت انفعال ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ میں وہ علم کیوں نہ سیکھوں جو ایسی غلطیوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ انھوں نے نحو سیکھنی شروع کی اور اس جہد اور کوشش سے سیکھی کہ سیکڑوں برس سے طلبہ اُن کا نام لے لے کر نحوی[3] ہو رہے ہیں۔ اشبیلیہ کے مشہور طبیب قاضی ابو بکر کو آغازِ عمر میں شطرنج کی بہت لت تھی۔ مثل ہے کہ کار بکثرت۔ کثرت نے وہ مہارت پیدا کی کہ اُن کا لقب شطرنجی پڑ گیا۔ یہ ذلیل لقب قاضی صاحب کے دل کو صدمہ پہونچاتا تھا۔ آخر اُن کی غیرت نے یہ مشورہ دیا کہ کسی علم میں کمال پیدا

---

۱ جزیرہ نمائے عرب پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلا یمن دوسرا حجاز تیسرا تہامہ چوتھا نجد پانچواں یمامہ (صناجۃ الطرب)

۲ اگلے زمانے میں طریقہ تعلیم یہ تھا کہ استاد کسی اونچے مقام پر بیٹھ کر کسی موضوع کی نسبت زبانی تقریر کرتا تھا اور شاگرد اُسکو سنتے اور ضبط کرتے تھے اس طریقہ کا نام املا تھا۔ وقت ضرورت ایک یا زائد اشخاص اس غرض سے کھڑے ہو جاتے تھے کہ اُستاد کے الفاظ بجنسہ شاگردوں تک پہنچاتے جائیں اُن لوگوں کو مستملی کہتے تھے یہ طریقہ دریسکے لیکچر کے طریقے سے مشابہ تھا۔

۳ نزہۃ صفحہ ۲

کرنا چاہیئے تاکہ اُس علم کی نسبت یہ داغ بدنامی مٹادے۔ غور کر کے انھوں نے طب کو پسند کیا اور اس فنِ شریف میں وہ کمال اور نام پیدا کیا کہ آج قریباً سات سو برس کے بعد ان کا حال آپ میرٹھ میں سُن رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نام آوری کے سامنے وہ بدنام کنندہ لقب کیا ٹھہرتا لوگ ابوبکر طبیب کو دیکھ کر شطرنجی قاضی صاحب کو بھول گئے۔[1] ادیب مشہور ابن جنّی موصل میں فن نحو کا درس دیا کرتے تھے ایک روز اسی میدان کے شہسوار ابوعلی فارسی وہاں وارد ہوئے اور ایک مسئلے میں جو ابن جنی سے اُلجھے تو وہ دم بخود رہ گئے اُن کو حیران دیکھ کر پختہ کار ابوعلی نے طنزاً کہا۔ زببت قبل ان تحصرم[2] اور اتنا کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔ اُن کے چلے آنے کے بعد ابن جنی نے دریافت کیا کہ یہ کون تھے۔ لوگوں نے کہا ابوعلی فارسی یہ سُن کر ابن جنی مسندِ تدریس چھوڑ کر ابوعلی کی شاگردی کے شوق میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب تک یہ اُن کی فرودگاہ پر آئیں وہ وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔ آخر اگلی منزل پر جا لیا اور تلمّذ کی آرزو ظاہر کر کے ساتھ ہو لئے۔ جب تک ابوعلی زندہ رہے انھوں نے اُن کا دامنِ عاطفت نہیں چھوڑا۔ اور اس طرح داغ خامی اپنے دامنِ حال سے چھڑا ڈالا۔ آمدم بر سر مطلب امام نضر بن شمیل نے چالیس برس صرف مختلف قبائل کی زبانوں کی تحقیقات کی خاطر صحرائے عرب میں بسر کر دیئے۔ اندلس کے طبیب ابن رومیہ نے اُن نباتات کے حالات دریافت کرنے کے لئے جو مغرب میں پیدا نہیں ہوتیں مدتوں سیاحت کی۔ اسپین سے مصر آئے اور مصر سے شام، عراق کا سفر کیا۔ ان ممالک کے تمام نباتات کو خاص ان کی روئیدگی کے مقامات میں جا کر مشاہدہ کیا اور اُن کے افعال و خواص کی تحقیقات کی۔[4] اسی طرح علم نباتات کے بے نظیر عالم

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۰۰ [2] نزہتہ۔ صفحہ ۴۰۰ حصرم غورہ انگور کو کہتے ہیں اور زبیب کہتے ہیں انگور خشک کو جو کشمش کے نام سے مشہور ہے۔ پس اس عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ تم خام ہونے سے پہلے پختہ ہو گئے [3] نزہتہ صفحہ ۱۱۱ [4] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۸۱

ضیاء الدین ابن بیطار نے خاص نباتات کی تحقیقات کی غرض سے ممالک روم، یونان اور اسپین کو چھان ڈالا۔ ان ملکوں کی تمام بوٹیاں اُن کی پیدائش کی جگہ جا کر دیکھیں اور اُن کے احوال تحقیق کر کے قلمبند کئے[1] ابوالمنظور نے بہت سی نئی نباتات ایسی دریافت کیں جن کا ذکر متقدمین کی کتابوں میں نہ تھا۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جو مقامات روئیدگی نباتات کے واسطے مشہور تھے مثلاً جبل لبنان (شام)، اُن میں پھرتے اور بوٹیوں کو دیکھتے اور جانچتے ایک مصوّر ہر رنگ کی روشنائی لئے اُن کے ہمراہ رہتا۔ نباتات کا خود مشاہدہ کر لینے کے بعد مصوّر کو دکھلاتے اور وہ اُس کے رنگ، شاخ اور برگ و بیج کا اندازہ کر کے ہو بہو اُس کی تصویر کھینچتا یہ محقق طبیب ایک بار کے مشاہدہ پر قانع نہ ہوتا۔ بلکہ نشوونما کے مختلف مدارج میں نباتات کا معائنہ کرتا۔ ایام نمو و تازگی کی علیحدہ تصویر کھچواتا اور زمانہ کمال کی جدا۔ اور جب وہ بوٹی خشک ہو جاتی تو ایک تیسرا نقشہ لیا جاتا۔ اسی طرح ہر بوٹی کی تصویریں اُس نے اپنی کتاب میں (جوادویہ مفردہ کے حال میں تھی) درج کی تھیں۔ جن کو دیکھ کر ناظرین کتاب ان نباتات کی مختلف اشکال صحیحہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے تھے۔ کاش اُن دنوں میں چھاپا ہوتا تو آج ایک عمدہ ثبوت اگلے مسلمانوں کی علمی تحقیقات کا ہم پیش کر سکتے[2]۔

علّامہ سید شریف کو ایام طالب علمی میں یہ شوق ہوا کہ شرح مطالع خود اُس کے مصنف سے پڑھیں۔ اسی دُھن میں وہ ہرات پہونچے اور علّامہ رازی سے ملے۔ اُن کی عمر اس وقت سو برس منزل کی انتہا پر پہنچ چکی تھی اور قوٰی اپنی آخری بہار دکھا رہے تھے۔ کہن سال علّامہ نے جوان ہمت سید کو پڑھانا اپنی طاقت سے باہر سمجھ کر اُن سے کہا کہ تم میرے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ چلے جاؤ۔ اُس کا پڑھانا میرا پڑھانا ہے اور چلتے وقت سفارش لکھدی۔

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [2] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۹

میر سید شریف کا شوق اُن کو خراسان سے مصر لے پہنچا۔ قاہرہ پہنچکر وہ مبارک شاہ سے ملے اور اُستاد کا خط اُن کو دیا۔ سفارش کے اثر سے یہ حلقۂ درس میں تو داخل کر لئے گئے لیکن نہ اُن کا مستقل سبق مقرر ہو سکا اور نہ جماعت میں قرأت کی اجازت ملی مجبوراً استماعت پر قانع ہونا پڑا۔ ایک شب مبارک شاہ صحن مدرسہ میں ٹہل رہے تھے کہ ایک جانب سے کسی کی آواز کان میں آنے لگی متوجہ ہو کر سنا تو میر سید شریف کہہ رہے تھے قال المصنف[١١] کذا وقال الاستاذ کذا واقول کذا۔ خوبیٔ بیان مبارک شاہ کے دل میں گھر کر گئی اور صبح کو اُنھوں نے سید جرجانی کو سب طلبہ پر مقدم کر دیا[١٢]۔ جہاں سیاح ابن بطوطہ جب اسکندریہ پہنچا تو شیخ روزگار برہان الدین اعرج کے حضور میں بھی گیا۔ شیخ نے اثنائے ملاقات میں اس سے اپنے تین بھائیوں کو سلام پہنچانے کی فرمایش کی جن میں سے ایک فرید الدین نامے ہند میں تھے دوسرے زین الدین سندھ میں اور تیسرے برہان الدین چین میں چنانچہ ابن بطوطہ نے دورانِ سیاحت میں ان سب کو مقامات مذکورہ میں پایا اور مشتاق بھائی کا سلام پہنچا دیا[١٣]۔

اس زمانے میں سفر جن مصیبتوں سے ہوا کرتا تھا اور سیاحت میں جو صعوبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں وہ ذیل کے واقعے سے خیال میں آسکتی ہیں۔

امام ابوحاتم رازی فرماتے ہیں کہ سفر میں ایک دفعہ میں جہاز سے اُترا تو خرچ بالکل پاس نہیں رہا تھا دو میرے رفیق اور تھے ان کا بھی مضمون واحد تھا۔ ہم تینوں نے تین دن فاقے سے پیدل سفر کیا۔ آخر تیسرے دن ایک مقام پر کثرت ضعف نے تھکا کر گرا دیا۔ رفیقوں میں ایک بیچارہ بڈھا تھا وہ گرتے ہی بیہوش ہو گیا۔ ذرا دیر کے بعد ہم دونوں نے

---

١١ یعنی مصنف کتاب نے یوں کہا۔ استاد نے یوں کہا اور میں یوں کہتا ہوں ١٢ تتمہ ج ا ص [illegible] ١٣ رحلہ ج ا ص [illegible]

پھر ہمت باندھ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔ بڈھے کو دیکھا تو بالکل غافل تھا مجبوراً اُس کو وہیں چھوڑا اور ہم آگے بڑھے تھوڑی دُور چلے تھے کہ میرے حواس نے جواب دیا اور میں غش کھاکر زمین پر گر پڑا۔ رفیق بڈھے کی طرح مجھکو بھی راہ میں پڑا چھوڑکر خود آگے بڑھا حسن اتفاق سے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کو ایک کشتی نظر آئی جو قریب ہی ایک مقام پر مسافر اُتار رہی تھی۔ یہ دیکھکر اس نے اظہار مصیبت کے لئے اپنی چادر ہوا میں اڑائی اس نشان بیچارگی کو دیکھکر مسافر متوجہ ہوئے اور کچھ لوگ اُس کے پاس آئے اور تشنگی سے بے دم دیکھکر پانی پلایا۔ جب پانی پی کر اُس کو تسکین ہوئی تو کہا کہ میرے دو رفیق اور اسی مصیبت کے مارے پیچھے چھوٹ گئے ہیں اُن کی خبرگیری ضرور ہے۔ مہربان مسافر یہ سن کر ہماری طرف آئے۔ میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک آدمی موتھ پر پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ جب مجھ کو ہوش آگیا تو پانی پلایا۔ اس کے بعد ہم سب ملکر بڈھے کے پاس گئے اور اُس کی بھی خدمت کی۔ آخر ہم نے ایک مقام پر چند روز ٹھہر کر آرام کیا تب جان میں جان آئی[1] حیف! ہمارے اسلاف تو ایسے اور ہم اُن کے اخلاف ایسے کہ ہمارے مقابلہ میں دنیا کی ساری قومیں علم وحکمت کی زیادہ قدرشناسی کی مدعی ہیں۔ اگر پچھلی ہمت کا ادنیٰ اثر بھی ہم میں ہوتا تو آج امتحان مقابلہ ہمارے واسطے ایک مہیب مسئلہ قرار نہ پاتا اور ہر صیغے اور شعبے میں ہم رعایت کی ذلیل صدا بلند نہ کرتے جس طرف کان لگائیے مسلمان طلبا اور اسلامیہ مدارس میں افلاس کی صدا بلند ہے۔ الضاف با لائے طاعت ست۔ لاکھ افلاس سہی لیکن چقندر کے پتے اور جڑی بوٹی کھانے کا اتفاق تو نہیں ہوتا۔ سچ یہ ہے کہ شوق اور ہمت نہیں ورنہ یہی کڑوے گھونٹ شربت کی طرح خوش گوار ہو جاتے اور ساری کڑی منزلیں آسان ہو جاتیں۔

کتابوں کا لکھنا چھاپے نے اس زمانہ میں کتابوں کا وجود اتنا آسان کر دیا ہے کہ

---

[1] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۴۲

اب اُس وقت کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہی جو لگلے زمانے میں کتابوں کے بہم پہنچانے میں پیش آتی تھی۔ آج کل عمدہ سے عمدہ کتاب دام خرچ کرنے سے بلا دشواری مل سکتی ہی لیکن پہلے یہ بات کہاں تھی۔ جو بھاری کام اب سیسے اور پتھر نے اُٹھا لیا ہے وہ اُس وقت کے طلبہ کو خود کرنا پڑتا تھا۔ یعنی وہ اپنے واسطے کتابیں خود لکھتے تھے گویا پڑھنے کے واسطے ان کو ٹک بھی خود بنانا پڑتی تھی۔ شقائق نعمانیہ میں لکھا ہے کہ ابتداءً جب علامۂ تفتازانی کی تصانیف روم میں پہنچیں اور درس میں مقبول ہوئیں تو اُن کے نسخے دام خرچ کرنے پر بھی نہیں ملتے تھے مجبوراً علامہ شمس الدین کو علاوہ جمعہ اور سہ شنبہ کی معمولی تعطیلوں کے دو شنبے کی تعطیل مدارس میں اور مقرر کرنا پڑی۔ پس ہفتے میں تین دن طلبہ کتابیں لکھتے تھے اور چار دن پڑھتے تھے۔[1] کثرتِ مشق اور رات دن کے لکھنے نے اگلے لوگوں کو تحریر پر ایسا قادر کر دیا تھا کہ اب اُن کی حکایتیں مشکل سے باور ہوتی ہیں۔

حافظ ابن فرات بغدادی نے جب وفات پائی تو کتابوں کے اٹھارہ صندوق چھوڑے جن کتابوں سے اٹھارہ صندوق بھر گئے تھے اُن میں سے اکثر خود ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ خوبی تحریر کی سند اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ محدثین کے نزدیک اُن کی لکھی ہوئی کتابیں صحتِ نقل اور جودتِ ضبط میں حجت اور سند خیال کی جاتی تھیں۔[2] سبط ابن جوزی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دادا (شیخ ابن جوزی) کو ایک بار برسرِ منبر یہ کہتے سنا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ جس شیخ وقت نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کی ہوں اُس کا دو ہزار جلدیں لکھ لینا ناممکن نہیں۔[3] جن قلموں سے انھوں[4] نے حدیث شریف کی کتابیں لکھی تھیں۔ اُن کا تراشہ جمع کرتے گئے تھے۔ جب وفات پانے لگے تو وصیت کی کہ غسل کا پانی

---

[1] شق۔ ج ۱ صفحہ ۳۰ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۲۰ [3] تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۱۳۸ [4] یعنی شیخ ابن جوزی نے

اُسی تراشے سے گرم کیا جائے چنانچہ اُن کے غسل کا پانی اُسی پاک ایندھن سے گرم ہوا[١]۔
حضرت یحییٰ بن معین نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ہات سے چھ لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ امام ابواُسامہ[٢] کوفی نے ایک سو دس برس کی عمر میں وفات پائی تاہم سلسلۂ تحریر آخر عمر تک قائم رہا۔ اُن کے بیٹے نے بیان کیا ہی کہ میرے والد نے جب اشعار عرب مدوّن کئے تو کچھ اوپر اسّی قبائل کا کلام تھا۔ ایک قبیلے کا کلام شائع کر چکتے تو اُس کے شکرانے میں ایک نسخہ کلام اللہ کا لکھ کر مسجد میں پہنچا دیتے۔ اس طرح اسّی سے زیادہ نسخے کلام پاک کے انھوں نے لکھ کر وقف کر دیئے[٣]۔ بعد وفات امام ابوجعفر طبری کی تصانیف کا حساب لگایا گیا تو ابتدائے شباب سے یوم رحلت تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط پڑا اور عام تحریر کا اندازہ کیا گیا تو چالیس ورق یومیہ ہوئے[٤]۔ حکیم المظفر مصری کے حال میں علامہ ابن ابی اصیبعہ لکھتے ہیں۔ عجیب تر یہ بات ہی کہ اُن کے کتاب خانے میں ہزاروں کتابیں ہر فن کی تھیں۔ مگر کوئی کتاب کسی فن کی اُن کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس پر خود اُن کے قلم کی کچھ نفیس و نادر باتیں فن کتاب کے مناسب لکھی ہوئی نہ ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنی آنکھ سے بکثرت طب اور دیگر فنون کی کتابیں حکیم مذکور کے کتاب خانے کی دیکھی ہیں جن پر اُن کا نام اور فوائد متفرقہ متعلق کتاب درج[٥] تھے۔ قوتِ تحریر پر واقعۂ ذیل بھی عمدہ شاہد ہی۔ مفتی قسطنطنیہ ابوسعود رومی نے بارہا ایک ایک دن میں ہزار ہزار رقعوں کا جواب لکھ ڈالا جن میں سے ایک بھی خوبی اسلوب اور حسن معنی کے لحاظ سے گرا ہوا نہیں ہوتا تھا[٦]۔

توجہ کامل اور شوق طلب

اس عنوان کے ضمن میں جو واقعات آگے مذکور ہوتے ہیں اُن میں آپ

---

[١] تذ-ج ١- صفحہ ٢٧٩۔ [٢] تذ-ج ٢ صفحہ ٢١٥ [٣] ابن-ج ١- صفحہ ٦٥
[٤] تذ-ج ٢ صفحہ ٢٧٩ [٥] عیون-ج ٢ صفحہ ١٠٠ [٦] العقد صفحہ ٢٠٥

علما کو زندگانی کی مختلف سختیوں میں پائینگے کسی کو سرد ملک میں شب کو مسجد کے دروازے پر کھڑا دیکھیں گے۔ کوئی بزرگ شدتِ گرما کے باعث پانی کے ایک بڑے ظرف میں بیٹھے ملیں گے۔ کوئی عالم آپ کو پورے پر دراز نظر آئینگے۔ کوئی اپنے جانی دشمن حاکم وقت کے خوف سے صحرا میں روپوش ملینگے۔ کسی کے دل میں "العشق نار تحرق ما سوی المطلوب" کا جلوہ دکھائی دیگا۔ غرض مختلف گرم و سرد حالات جو ایک انسان پر گزر سکتے ہیں۔ اُن پر آپ گزرتے دیکھیں گے لیکن ہر حال میں آپ اُن کے دل کو اطمینان سے اپنے مطلوب یعنی علم کی طلب میں مشغول پائینگے اور واقعات ثابت کرینگے کہ یہ حوصلہ فرسا حوادث ان کے دلوں کو علم کی جانب سے تفرقہ پیدا کرنے میں قاصر تھے بعض صورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ وہ بظاہر ایک کام میں مصروف ہیں مگر قلب ان کا علم کی جانب ہے۔ کوئی حکیم سو سو مرتبہ ایک ایک کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ کسی فقیہ کے زیر مطالعہ ایک ایک کتاب پچاس پچاس برس رہی ہے۔ ان تمام واقعات سے ان کی توجہ کامل اور ماسوا سے بے نیازی کا پورا پتا ملے گا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حصول کمال کی جانب جب تک انسان اپنے دل کو پورے طور سے مائل نہ کردے کمال حاصل ہو نہیں سکتا۔ اس زمانے کے مسلمان بھی مدارس کے حجروں میں اپنی عمریں صرف کر دیتے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو جاتے ہیں مگر کمال تو بڑی چیز ہے اس کا کوئی شمہ بھی ان میں نظر نہیں آتا۔ کوئی اس کے اسباب کچھ ہی بتائے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ صرف توجہ اور ہمت کا تفاوت ہے۔ اگر ہم وہی توجہ پیدا کرلیں تو وہ کمالات پھر پیدا ہو سکتے ہیں آیہ کریمہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى صاف صاف بتلا رہی ہے کہ ہر شخص اپنی اپنی کوشش کا پھل پاتا ہے۔ جو کتابیں علما کے حالات میں طبقات کے طور پر لکھی گئی ہیں اُن پر نظر غائر ڈالی جائے تو عیاں ہوتا ہے کہ جتنا طبقہ بہ طبقہ جہد طلب میں تفاوت آتا گیا اُسی قدر درجہ بدرجہ

کمالات علمیہ میں تنزل ہوتا گیا۔ سلک الدّرر میں (جو بارہویں صدی کے حالات میں ایک ضخیم کتاب ہی) ایک بھی عالم پانچویں یا چھٹی صدی کے علما کے مثل نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ ہی بارہویں صدی کے ایک عالم کی بھی جہد طلب پانچویں یا چھٹی صدی کے علما کی جانفشانی کے مشابہ نہیں۔ اگر ہم سلک الدرر کے کسی عالم کے حالات اُن حالات کے مثل پائیں جو ابن خلکان یا نزہتہ الالبا کے علما کے ہیں اور پھر دیکھیں کہ ویسے کمال کو اوّل الذکر نے نہیں پایا تو بے شک ہم کو توجہ اور شوق کے سوا کسی اور سبب کے تلاش کی ضرورت پیش آئے گی۔ لیکن جب ہم ہمتوں کا تفاوت پاتے ہیں تو پھر دفع الزام کے لئے اور اسباب کا پیدا کرنا روش حق سے بعید ہی۔

خیالِ بالا کو واقعات ذیل سے ملائیے اور اس طرح اُس کی صحت یا غلطی خود بخود منکشف ہو جائیگی۔ کمال توجہ کا اظہار فارسی کی اس مثل میں کیا گیا ہی "دل بیار دست بکار" امام دار قطنی ایک مرتبہ ابتدائے سن میں اسمٰعیل صفار کی مجلس املا میں حاضر تھے شیخ تو املا میں مصروف تھے اور یہ ایک کتاب کی نقل کرتے جاتے تھے۔ ایک شخص اُن کی بے توجہی دیکھ کر جھنجلایا اور کہا کہ تم نقل کتاب میں مشغول ہو پھر تمہارا سماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہی۔ دار قطنی نے یہ اعتراض سُن کر کہا کہ سماع میں فرق ہوتا ہی تم تو ہمہ تن متوجہ ہو کر سن رہے ہو۔ بتلاؤ تو شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں روایت کی ہیں۔ معترض کو مجموعی تعداد کا خیال نہ تھا لہذا اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ دار قطنی نے کہا کہ اٹھارہ حدیثیں اس وقت تک املا ہوئی ہیں۔ پہلی کا یہ متن ہی یہ اسناد۔ دوسری کا یہ متن ہی یہ اسناد غرض اسی طرح وہ ساری حدیثیں سنا دیں۔ حاضرین اُن کا یہ ضبط دیکھ کر دنگ رہ گئے۔[1]

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۰۰

ایک مرتبہ دو شیخ خراسان سے مکۂ مکرمہ میں آئے اور حرم محترم کے دو جانب بیٹھ کر انھوں نے ایک ہی وقت میں روایت حدیث کی۔ دونوں کے سامعین اور مستملی جدا جدا تھے۔ حافظ کبیر اثرم دونوں کے بیچ میں بیٹھ گئے اور دونوں کا بیان برابر لکھتے رہے بے شک یہ توجہ کی یکسوئی کا کرشمہ تھا جس نے ایک سامع کو دو سامعوں کی قوت دیدی بہت سے حاضرین مجلس ایسے ہوتے ہیں کہ سب کچھ سننے کے بعد بھی اُن کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا سنا اور کم تو بھی اُن کو نزدیکان بے بصر کا خطاب دلاتی ہے[۱]۔ علی بن الحسن راوی ہیں کہ ایک شب میں نماز پڑھ کر مسجد سے باہر آنے کو حضرت عبداللہ بن المبارک کے ساتھ ساتھ اُٹھا اُس رات کو سردی کی بہت شدت تھی دروازے پر پہنچ کر ابن المبارک نے ایک حدیث کا ذکر چھیڑا۔ جب وہ فرما چکے تو میں نے اُس کی نسبت کچھ کہا پھر اُس کے بعد پھر اُنھوں نے کچھ بیان کیا۔ غرض اسی طرح سلسلۂ کلام جاری تھا کہ فجر کی اذان ہوئی اور ہم دونوں مسجد کو لوٹ آئے[۲]۔ حافظ حدیث حمیدی میورقی جزیرۂ میورقہ[۳] میں پیدا ہوئے شام و عراق میں علم حاصل کیا اور بغداد میں آ کر رہے۔ گرمیوں میں جب شب کو لکھنے بیٹھتے اور گرمی ایذا پہنچاتی تو ایک بڑے سے ظرف میں پانی بھرتے اور اُس کے اندر بیٹھ کر لکھتے[۴]۔

ابو عمرو بن العلاء (امام ادب) ایک زمانے میں سفاک حجاج ابن یوسف کے خوف سے صحرائے عرب میں بھاگے پھرتے تھے ادھر تو جان کے لالے پڑ رہے تھے اُدھر اس علامۂ ادب کو یہ تلاش تھی کہ آیا لفظ فرجہ (بمعنی کشائش) بالضم ہے یا بالفتح ایک روز اثنائے بادیہ پیمائی میں ایک قائل کو اُنھوں نے یہ شعر پڑھتے سنا ؎

ربما تجزع النفوس من الامر   له فرجة كحل العقال

---

[۱] تذکرہ ج ۲ صفحہ ۱۴۹ [۲] تاریخ ۱ صفحہ ۲۵۲ [۳] تجاربکا واقعہ تجربہ روم [۴] تذکرہ ج ۴ صفحہ ۱

فرجہ کو اُس نے زبر سے ادا کیا۔ یہ شعر پڑھکر وہ بدوی ابوالعلا کی طرف مخاطب ہوا اور کہا سنتے ہو۔ ظالم حجاج مرگیا۔ ابوالعلا کہتے ہیں کہ مجھکو اُس وقت یہ تمیز نہ ہوسکا کہ آیا میں کس بات سے زیادہ خوش ہوا۔ لفظ فرجہ کی صحت ہو جانے سے یا اپنے عدوئے جانی کی خبرِ وفات پانے سے۔ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہی کہ اُس شیفتۂ علم کے نزدیک ایک ایک علمی مسئلہ جان کے برابر عزیز تھا۔ اُسی کی بدولت ابوالعلا کو یہ بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ امام فن قرار پائے۔ جو لوگ اپنی جسمی آسائشوں کو بھی علم پر قربان نہ کرسکیں وہ کیا شان حاصل کرسکتے ہیں۔ اب مدرس بہت مدارس بہت لیکن شوق وہمت نایاب اس لئے ہماری علمی محفلوں میں ہر طرف سنّاٹا سا ہی[۱]

ابوعبید بن سلام نے ایک بار اپنے تلامذہ سے کہا کہ میں نے چالیس برس اپنی کتاب غریب الحدیث کی تصنیف میں صرف کئے ہیں۔ اکثر فوائد مجھ کو لوگوں سے باتوں باتوں میں ہاتھ لگ جاتے تھے اور میں اُن کو موقع موقع سے اُس کتاب میں درج کرتا جاتا تھا۔ ان فائدوں کے حاصل ہونے سے اتنی خوشی مجھ کو حاصل ہوتی کہ میں ساری ساری رات فرطِ مسرت سے جاگتا رہتا۔ تم چار پانچ مہینے بھی میرے پاس آکر رہتے ہو تو کہتے ہو کہ ہم بہت رہے[۲]

حضرت امام زہری کا مطالعے کے وقت یہ عالم ہوتا کہ ادھر اُدھر کتابیں ہوتیں اور اُن کے مطالعے میں ایسے مصروف ہوتے کہ دنیا ومافیہا کی خبر نہ رہتی۔ بی بی کو کب گوارا ہوسکتا ہی کہ اُس کے سوا کسی اور کی اس قدر گنجائش شوہر کے دل میں ہو۔ ایک روز بگڑ کر کہا۔ واللہ لھذہ الکتب اشدّ علیّ من ثلٰث ضرائر یعنی قسم ہی رب کی یہ کتابیں مجھ پر تین سوکنوں سے زیادہ بھاری ہیں[۳]۔ امام شافعی کے جلیل القدر شاگرد امام مزنی نے

---

[۱] نزہۃ۔ صفحہ ۳۲ [۲] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۱۹ [۳] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۵۱

اپنے اُستاد کی کتاب الرسالہ کا پچاس برس مطالعہ کیا اور وہ خود ناقل ہیں کہ ہر مرتبہ کے مطالعے میں مجھ کو نئے نئے فوائد حاصل ہوتے گئے۔[1]

ارسطو کی کتاب النفس کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابو نصر فارابی کے قلم کی یہ عبارت تحریر تھی انی قرأت ھذا الکتاب مِأۃ مرۃ یعنی میں نے اس کتاب کو سو مرتبہ پڑھا ہے۔[2]

شیخ الرئیس کے مطالعے کی بھی ایک حکایت قریب قریب اس کے ہے جس کو شیخ نے خود بیان کیا ہے۔ ابن سینا کا بیان ہے کہ ایام طالب علمی میں جب میں نے کتاب ما بعد الطبیعۃ کا مطالعہ شروع کیا تو مطلقاً وہ میری سمجھ میں نہیں آئی اور نہ واضع فن کی کوئی غرض مفہوم ہوئی۔ انتہا یہ ہے کہ چالیس مرتبہ میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ عبارت تو یزبان ہو گئی لیکن مدعا نے اپنی جانب سے بالکل مایوس کر دیا ع مدعا عنقا تھا اُس کے عالم تقریر کا۔ اتفاقاً اُسی عرصے میں ایک روز عصر کے وقت کتاب فروشوں میں میرا گزر ہوا۔ وہاں ایک شخص ایک کتاب لایا اور مجھ سے کہا کہ یہ کتاب فن ما بعد الطبیعۃ میں ہے آپ لے لیجئے۔ چونکہ میں اس فن کو بے معنی خیال کر چکا تھا اس لئے خریداری سے انکار کر دیا۔ دلال نے منت کی اور کہا کہ کتاب سستی ہے صرف تین درہم قیمت ہے اور مالک ضرورت مند ہے۔ میں نے اُس کے اصرار سے مجبور ہو کر کتاب لے لی۔ خریدنے کے بعد کھول کر دیکھی تو ابو نصر فارابی کی تصنیف نکلی جس میں مصنف نے اغراض کتاب ما بعد الطبیعۃ سے بحث کی تھی۔ میں خوش خوش مکان پر آیا اور اُس کے مطالعے میں مصروف ہوا۔ اصل کتاب چونکہ پہلے سے ازبر تھی اس لئے نوخرید کتاب کے پڑھتے ہی سب مشکلیں آسان ہو گئیں۔[3]

ابو العباس ثعلب نے بغداد میں اسحٰق موصلی کے کتاب خانے میں ایک ہزار جز فن

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۱ [2] ابن۔ ج۔ ۲۔ صفحہ ۲، [3] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۴

لغت کے دیکھے جو سب کے سب اسحٰق کی سماع میں آچکے تھے۔[1]

مولانا حماد الدین رومی نے ایک رات طلبہ کے حجروں میں مخفی طور پر گشت کیا! ایک طالب علم کو دیکھا کہ تکئے سے لگا ہوا مطالعۂ کتاب میں مصروف ہے۔ دوسرے کو دیکھا کہ دو زانو مستعد بیٹھا ہے کتاب زیر مطالعہ ہے اور موقع موقع سے کچھ لکھتا بھی جاتا ہے یہ دیکھ کر تجربہ کار اُستاد نے اول کی نسبت کہا۔ انہ لا یبلغ درجۃ الفضل[2] دوسرے کی نسبت فرمایا سیحصل الفضل ویکون لہ شان فی العلم[3] تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشین گوئی بالکل سچی تھی[4]۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ امام زہری ہوں یا امام مزنی، حکیم فارابی ہوں یا شیخ الرئیس ان کے علمی کمالات کی اصل بنیاد یہی مطالعے کی کثرت تھی کہ ایک ایک کتاب کو سو سو بار پڑھتے تھے اور پچاس پچاس برس دیکھتے اب مطالعہ معدوم لہذا علمیت معلوم۔ بیدردہیں وہ لوگ جو ان بزرگوں کی جانکاہیوں کو نظر انداز کر کے اُن کے علمی کمالات کو محض اس زمانے کے آثار کا ثمرہ بتاتے اور اپنے زعم باطل میں اپنے لئے ایک عذر تراشتے ہیں۔ اگر ابو نصر یا شیخ الرئیس کی سی جانفشانی آج کل کے مسلمان کریں تو ضرور ان کے برابر ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اگر جانفشانی کو اُن کی جانکاہی سے بڑھا دیں تو اُن سے بڑھکر ہو سکتے ہیں۔ علم و حکمت کچھ نبوت نہ تھی، جو کسی ذات پر ختم ہو گئی اور ہم پر یہ ایمان لانا واجب ہو گیا کہ فارابی او شیخ کمالات علمیہ کو ختم کر گئے ؎

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ابو البرکات طبیب مشہور ابتدا میں موسوی ملت کے پیرو تھے اُس عہد کے اُستاد طب ابو الحسن کی

---

[1] ابن سعد ج ۱۔ صفحہ ۹۶ [2] یہ مرتبۂ فضیلت کو کسی طرح نہیں پہنچ سکتا [3] یہ البتہ فاضل ہو گا اور شانِ علما حاصل کرے گا۔ [4] شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۵

یہ آن تھی کہ وہ منکرین حضرت مسیحا کو طب نہیں پڑھاتے تھے۔ ابوالبرکات اُن کے پاس گئے لیکن ناکام واپس آئے۔ اُس طرف سے جب مایوس ہوئے تو شوق نے ایک اور راہ بتلائی یعنی انھوں نے دربان کو ملایا اور درس کے وقت دروازے میں چھپکر بیٹھے رہنے کی اجازت لے لی۔

نخواہم داد دربانِ ترا بہر درون زحمت   پسندست این کہ گاہے بشنوم آواز بیرون را

سال بھر کامل اسی طرح باکمال اُستاد کی تعلیم کا فیض حاصل کرتے رہے۔ ایک روز کسی مسئلہ میں اُلجھاؤ پڑ گیا اور کسی طرح گتھی نہ سلجھی۔ آخر چھپے رستم ابوالبرکات جسارت کرکے نکل آئے اور کہا کہ اجازت ہو تو کچھ میں بھی عرض کروں۔ اُستاد نے اجازت دی اور انھوں نے اُس کو جالینوس کے قول سے حل کرکے کہا کہ فلاں روز یہ قول آپ ہی نے نقل فرمایا تھا۔ ابوالحسن نے حیرت سے پوچھا کہ تم نے میرا بیان کیونکر سُنا۔ انھوں نے صورتِ حال گزارش کی۔ حکیم موصوف کے دل پر اُن کے شوق کا گہرا اثر پڑا اور اعتراف کیا کہ ایسے طالب کو محروم رکھنا حلال نہیں۔ چنانچہ اُسی روز ابوالبرکات کو شاملِ درس کر لیا۔[1]

خطیب تبریزی شارح حماسہ کو ایک کتاب لغت ابوالمنصور کی تصنیف ملی جو کئی چھوٹی چھوٹی جلدوں میں تھی۔ اُس کے مطالب حل کرنے وہ اپنے شہر کے ایک عالم لغت کے پاس گئے۔ عالم موصوف نے اُن کو یہ مشورہ دیا کہ ابوالعلاء معرّی کے پاس چلے جاؤ۔ خطیب نے اُن اجزاء کو ایک تھیلے میں بھر کر پشت پر ڈالا اور پیادہ پا تبریز سے معرّہ (واقع ملک شام قریب حماۃ) کو چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں اُس کتاب کی جلدیں پسینہ سے ایسی نمناک ہو گئی تھیں کہ بغداد میں لوگوں نے دیکھیں تو گمان کیا کہ پانی میں

---

[1] عیون۔ ج ۱ صفحہ ۲۷۹

بھیگ گئی ہیں۔ غرض اسی حال میں مَعَرّہ پہنچے اور ابوالعلاء کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کی مشکلات حل کیں[۱]۔ علامہ ابن ابی اُصیبعہ نے اپنے عم مکرم رشید الدین طبیب کی طالب علمی کا حال کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ ہم اُس کو زمانۂ ماضی کے طرز طالب علمی اور طریقۂ کسب علوم ظاہر کرنے کے لئے یہاں نقل کرتے ہیں۔ رشید الدین نے اول کلام اللہ تمام ضروری مراتب کے لحاظ کے ساتھ حفظ کیا۔ حفظ کلام پاک سے فارغ ہو کر فن حساب کی تحصیل کی۔ حساب کے بعد فن طب پڑھنا شروع کیا۔ مصر کے رئیس الاطبا اُن کے والد کے دوست تھے اس لئے رشید الدین کو انھوں نے خود طب شروع کرائی اور جالینوس کے سولہ رسالے پڑھائے جن میں سے چند ابتدائی لفظ بہ لفظ حفظ کئے گئے۔ ان رسالوں کو رئیس الاطبا سے پڑھ کر اور اساتذۂ فن سے سبق لینے لگے۔ نری کتاب خوانی پر قناعت نہ تھی بلکہ سبق سے فارغ ہو کر بیمارستان (شفاخانہ) جاتے اور وہاں کے مریضوں کو دیکھکر معالج اطبا نے جو مرض تشخیص اور علاج تجویز کیا ہوتا اُس کو سنتے۔ اسی ضمن میں فن کحالی (آنکھ بنانا) سیکھا اور اُس کا عمل نفیس الدین سے (جو بیمارستان میں اسی صیغے کے افسر اعلیٰ تھے) حاصل کیا اور جراحی کی مشق بھی شفاخانہ مذکورہ میں کی۔ فن طب کے ان مشاغل کے ساتھ اور علوم سے بھی وہ بے خبر نہ تھے ادب اور فلسفہ عبد اللطیف بغدادی سے اور منطق کا ایک سبق علوم حکمیہ کے اُستاد سدید الدین منطقی سے پڑھتے۔ ابو محمد جعفری سے فن نجوم اور ابن الدیجور سے فن موسیقی حاصل کرتے بیس برس کی عمر میں شام پہنچکر انھوں نے مطب شروع کر دیا۔ بااین ہمہ طب رضی الدین سے پڑھتے رہے اور وہاں کے مشہور اُدباسے ادب۔ اتفاقاً اُن کے استاد عبد اللطیف بغدادی بھی وہاں پہنچ گئے تو ان سے

---

[۱] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۳۳

فلسفے کا مشغلہ پھر جاری کر دیا۔ اس جانفشانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہنوز اُن کا سن پچیس برس کا نہوا تھا کہ طب میں اُن کو نمود حاصل ہو چلی اور مذکورۂ بالا علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ علاوہ ان علوم کے رشید الدین زبان ترکی اور فارسی میں بھی ماہر تھے۔ بلکہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ حکایت بالا سے یہ بات ثابت ہوتی ہی کہ اگلے اطبا اس فن شریف کے تمام شعبے حاصل کرتے تھے اور آج کل کے اطبا کی طرح اُن کا علاج دوسروں کے بھروسے پر نہیں چلتا تھا۔[1] امام طبرانی کی وسعت معلومات دیکھ کر ایک شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ آپ کا علمی خزانہ اس قدر مالا مال کیوں کر ہوا؟ تو امام ممدوح نے فرمایا کہ جانِ عزیز تیس برس میری کمر نے بوریے کے سوا اور کسی بستر کا لطف نہیں اُٹھایا۔[2]

امام ادب ثعلب ناقل ہیں کہ پچاس برس سے برابر میں ابراہیم حربی کو اپنی ہر مجلس لغت و ادب میں موجود پاتا ہوں۔[3] امام رازی کو تاسف ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت کیوں علمی مشاغل سے خالی جاتا ہی۔ چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ واللہ انی لاتاسف فی الفوات عن الاشتغال بالعلم فی وقت الاکل فان الوقت والزمان عزیز۔ یعنی خدا کی قسم مجھکو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس آتا ہی کیونکہ فرصت وقت بہت عزیز چیز ہی ؎

در بزم وصالِ تو ہنگامِ تماشا　　نظّارہ ز جنبیدنِ مژگان گلہ دارد

امام رازی اگر اوقات کو عزیز نہ سمجھتے تو نہ اُن پر علوم کے راز کھلتے اور نہ ان کو کوئی امام کہتا۔[4] محویت شوق کا یہ لطیفہ بھی قابل سننے کے ہی کہ ادیب مشہور ابو محمد اعرابی اپنے چہرے پر روغن مل کر آفتاب کے سامنے بیٹھا کرتے تھے تاکہ ان کا رنگ بدویوں کی طرح کالا ہو جائے اور اعرابی کا لقب ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے اُن پر صادق ہو۔ چنانچہ میدانی

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۴۰ [2] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۱۸ [3] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۲۲ [4] عیون۔ ج ۲ صفحہ ۲۳

طلب میں اُن کو یہ سرخ روئی حاصل ہوئی کہ "اسود" کا خطاب مل گیا اور آج تک اسی لقب سے وہ تاریخ میں مشہور ہیں۔ فدائیانِ شوق کا یہ بھی ایک رنگ ہے[51]۔ مولانا خسرو سلطان محمد خاں فاتح قسطنطنیہ کے وقت میں نہایت باوقار اور عہدۂ قضا پر ممتاز تھے۔ اگرچہ بہت سے خدام ان کی خدمت میں تھے تاہم مطالعے کے کمرے میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے چراغ روشن کرتے اور آتش خانے میں آگ سلگاتے[52]۔ اسحٰق بن سلیمان طبیب سو برس کے ہوکر فوت ہوئے۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی اور نہ مدت العمر انھوں نے شادی کی۔ آخر عمر میں ایک مرتبہ کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ کے دل میں اولاد کی تمنا ہے۔ تو اُس دانا حکیم نے جواب دیا کہ اپنی کتاب حمیات کے ہوتے ہوئے اولاد نہ ہونے کا کبھی خیال بھی مجھ کو نہیں آتا[53]۔

امام یحییٰ ناقل مُوطّا مدینہ منورہ میں ایک روز امام مالک کے درس میں حاضر تھے کہ غوغا اُٹھا کہ ہاتھی آیا۔ عرب میں ہاتھی عجوبہ چیز ہے اس آواز کے سنتے ہی سارے طلبہ درس چھوڑ کر بھاگ اُٹھے مگر یحییٰ اسی طرح اطمینان سے بیٹھے رہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ یحییٰ! تمہارے ملک اندلس میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی جاکر دیکھ آؤ۔ اُن کے دل میں وہی خیال بس رہا تھا۔ جواب دیا کہ حضرت! اندلس سے میں آپ کو دیکھنے اور علم سیکھنے آیا ہوں ہاتھی دیکھنے کے واسطے خانماں نہیں ہوا[54]

ببست دیدۂ مجنوں زخویش و بیگانہ   چہ آشنا نگہے بود چشم لیلیٰ را[55]

ابوبکر بن بشار ادب کے مشہور امام بغداد میں شاہزادوں کے اتالیق تھے۔ ایک روز قصرِ خلافت کو جاتے ہوئے نخاس سے گزرے وہاں اُن دنوں ایک جاریہ آئی ہوئی تھی جس کے حسن اور سلیقے کا سارے بغداد میں شہرہ تھا۔ ابن بشار اس کو دیکھ کر مفتوں ہوگئے۔ جب دار الخلافہ میں پہنچے تو خلیفہ نے پوچھا کہ آج دیر میں کیوں آئے۔ انھوں نے ماجرا عرض کیا۔ یہ سن کر خلیفہ نے

---

[51] نزہۃ صفحہ ۴۳، [52] شق۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۶ [53] عیون ج صفحہ ۳۱، [54] ابن ج ۲ صفحہ ۲۱۶

در پردہ خدام کو حکم دیا کہ وہ جاریہ خرید کر ابن بشار کے مکان پر اُن کے پہنچنے سے پہلے پہنچا دی جائے۔ جب علامہ ممدوح مکان پر واپس آئے تو جاریہ کو بیٹھا پایا۔ دریافت کیا تو حال معلوم ہوا۔ اُس کو تو انھوں نے بالا خانے پر بھیج دیا اور خود وہیں بیٹھ کر ایک علمی مسئلے پر (جس کی تحقیقات میں وہ اُن روزوں مصروف تھے) غور کرنے لگے طبیعت تو اور ہی طرف لگ رہی تھی الجھنے لگے قلب کا یہ رنگ دیکھ کر ابن بشار نے خادم کو آواز دی اور کہا کہ اس شہر آشوب کو لے جا کر واپس کر آؤ۔ میرے دل میں اُس کی اتنی قدر نہیں ہے کہ میرے خیال کو علم سے پھیر لے۔ چنانچہ خادم گیا اور جاریہ کو واپس کر آیا[1]

حفظ و استحضار علمی

یہ ایک مشہور مقولہ ہے کہ "علم سینہ بہ از علم سفینہ" علما کا ایک وقت تھا جب کتاب کا وجود بھی مسلمانوں میں نہ تھا۔ جو کچھ اُستادوں سے پڑھتے اور سیکھتے، صفحۂ حافظہ پر ثبت کرنا پڑتا۔ یہاں تک کہ کاغذ و قلم کی مدد کو وہ عار سمجھتے تھے چنانچہ بعض علمائے سلف فخریہ بیان کرتے کہ ہم نے کبھی سپیدی پر سیاہی کے دھبے نہیں ڈالے گویا اُن کے دماغ کتاب خانے تھے جن میں علمی مسائل خوبی اور خوش اسلوبی سے چنے ہوئے تھے۔ اسی قوتِ حافظہ کی وجہ سے اُس زمانے میں تعلیم کا طریقہ املا کے طرز پر تھا۔ حق یہ ہے کہ جیسے اساتذۂ فن اس روش تعلیم نے پیدا کئے وہ کتاب خوانی سے پیدا نہ ہو سکے۔ جتنے فن آج اسلام میں مدوّن ہیں اُن کے رؤسا و کملا اُس عصر میں ملیں گے جب طریقۂ املا رائج تھا۔ متأخرین کا سرمایۂ فخر حاشیہ و شرح نویسی ہے متقدمین کو مجتہدانہ قوت پر ناز تھا۔ اُن بزرگوں کے حفظ و استحضار علمی کے واقعات دیکھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کیسی شاقہ محنتیں وہ علوم کی تحصیل میں برداشت کرتے ہونگے۔ اُن حکایتوں پر اپنی حالت کو

---

[1] نزہتہ۔ صفحہ ۳۳۶

قیاس کرکے بدگمانی کی نظر ڈالنا آئینِ حق سے بعید ہی۔ یہ ظاہر ہی کہ انسان کے تمام قویٰ مشق اور کثرتِ کار سے ترقی کرتے ہیں اور ترقی کی کوئی حد معیّن نہیں آیندہ دورانِ بیان میں آپ کو ایسی حکایتیں ملیں گی جن کو معتبر مورخین نے چشم دیدہ لکھا ہی یا دوسری عینی شہادت کو نقل کیا ہی۔ بعض ائمہ ثقات نے اپنے حالات خود نقل کئے ہیں۔ ان حالتوں میں میری رائے ناقص میں کسی شک و شبہ کی گنجائش بہت کم رہتی ہی۔ رفتہ رفتہ کتابیں تصنیف ہوئیں اُن پر اعتماد بڑھا اور قوت حافظہ بیکاری کی وجہ سے مضمحل ہوتی گئی جو علم متقدمین کے دماغوں میں تھا وہ متاخرین کے کتاب خانوں میں آکر ٹھیرا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگلوں کے حالات پچھلوں کے قیاس سے بھی باہر معلوم ہونے لگے۔

غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ متقدمین کی قوت علمیہ کو ان تین ذرائع سے بہت مدد ملتی تھی۔ اولاً حفظ، ثانیاً کتابوں کا اپنے ہاتھ سے لکھنا، ثالثاً کثرت مطالعہ۔ متاخرین سے رفتہ رفتہ یہ سب سلب ہوگئے۔ حفظ کو کتابوں کی تصنیف نے باطل کردیا اور تحریر کتابوں کی کثرت سے فضول ہوگئی اور اس زمانے میں جب کہ مطابع کتابوں کے وجود سے دنیا کو مالامال کر رہے ہیں کتابوں کی نقل کرنی تضیع اوقات سے زائد نہیں خیال کی جاسکتی۔ ایک مطالعہ باقی تھا اس کو ہمارے زمانے میں اُس طرز تحشیہ نے بالکل غارت کردیا جو اب بدقسمتی سے رائج ہوگیا ہی۔ ضمائر کے مرجعے۔ اشاروں کے مشارٌ الیہ ہندسوں کی مدد سے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ قریباً ہر ہر لفظ پر حاشیہ بلکہ حواشی نقل کئے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہی کہ طلبہ ان کتابوں کو خرید کر نہ مطالعہ کی محنت شاقہ اُٹھاتے ہیں نہ اساتذہ کی تقریریں کو پورے طور سے قابو میں کرتے ہیں۔ اسی اعتماد نے کہ ہماری کتاب میں سب کچھ لکھا ہی جب ضرورت ہوگی دیکھ لینگے دماغی قوت کا بالکل ستیاناس کردیا۔

مجھ سے اس عہد کے ایک مشہور فاضل نے اپنی طالب علمی کا ایک قصہ بیان کیا کہ میر زاہد

رسالہ پڑھنے کے وقت ہمارا یہ عالم تھا کہ جو جو رموز اور نکات اُستاد کی زبان سے نکلتے ہماری یہ کوشش ہوتی کہ دماغوں میں نقش ہو جائیں۔ کیوں کہ اگر استاد کی زبان سے نکل کر دماغوں میں نہ ٹھہرتے تو پھر کہاں ملتے۔ غرض پڑھتے وقت اُستاد کے بیانوں کو پوری توجہ سے سُن کر خیال میں رکھتے درس سے فارغ ہو کر اُن کا خلاصہ لکھتے اور لکھے ہوئے کو یاد کرتے تھیں دنوں میں لکھنؤ یا کانپور سے رسالۂ مذکور محشیّٰ ہو کر نکلا اور نکلتے نکلتے مدارس میں پھیلا۔ اُس کے خریدتے ہی طلبہ کی ہمت میں قصور آ گیا اور انھوں نے سمجھ لیا کہ جو اُستاد کی زبان پر ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ پھر جانفشانی بے کار ہے افسوس ہے کہ کتابوں میں سب کچھ تھا مگر اُن کے دماغوں میں کچھ بھی نہ آیا۔ جو کتابیں اگلے اساتذہ کو دیکھنے کو نہ ملتی تھیں آج وہ دکانوں میں بھری پڑی ہیں۔ لیکن علم کا قحط ہے۔

امام ابو عیسیٰ ترمذی مصنف جامع ترمذی (جو صحاح ستہ میں شامل ہے) فرماتے ہیں کہ میں نے دو جزا ایک شیخ کے روایت کردہ احادیث کے لکھے تھے حسن اتفاق اُسی عرصہ میں خود وہ شیخ مجھ کو مل گئے۔ میں نے احادیث مذکورہ کی اجازت طلب کی اور انھوں نے میری استدعا قبول فرما کر اُن احادیث کو سنانا شروع کر دیا۔ مجھ کو خیال تھا کہ مذکورۂ بالا دونوں جز میرے پاس ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بجائے اُن کے دو سادے جز میں نے غلطی سے رکھ لئے تھے۔ مجھ سے سوائے اس کے کچھ نہ بن پڑا کہ وہی سادے جزہات میں لے کر شیخ کی حدیثیں سننے لگا۔ سوء اتفاق سے شیخ کی نظر اُن اوراق پر پڑ گئی اور بگڑ کر کہا کہ تم کو مجھ سے شرم نہیں آتی۔ میں نے اصلی ماجرا بیان کیا اور کہا کہ جو حدیث آپ سناتے ہیں مجھ کو یاد ہوتی جاتی ہے۔ شیخ کو میرے قول کا اعتبار نہ آیا اور فرمایا سناؤ۔ میں نے سب سُنی ہوئی حدیثیں لفظ بلفظ سنا دیں۔ اُن کا شبہ اب بھی نہ گیا۔ اور کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ حدیثیں میرے سنانے سے

پہلے تم حفظ کر چکے تھے۔ میں نے گزارش کی کہ اور نئی حدیثیں بطور امتحان روایت فرمایئے۔ چنانچہ چالیس حدیثیں اُنھوں نے نئی سنائیں اُن کو بھی میں نے فوراً دہرا دیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔[1] واقعۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ مشق اُن کے حافظہ کی قوت کو کیا بڑھا دیتی تھی کہ غور سے سننا اور حفظ ہو جانا یہ دونوں عمل اُن کے واسطے ایک ہو گئے تھے

داؤد ابن سمعہ نے ایک بار کہا کہ لوگ حفظ کے بارے میں ابو حاتم رازی اور ابو زرعہ کی نظیر دیا کرتے ہیں میں نے واللہ قرطبہ سے بڑھکر کوئی حافظ نہیں دیکھا۔ ایک دفعہ میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنی کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ ان کتابوں میں سے جس کو چاہو اُٹھالو میں حفظ سُنا دوں گا۔ میں نے امتحاناً ایک کتاب اُٹھا کر کہا کتاب الاشربہ۔ میں نے اتنی تحریک کی تھی کہ اُن کی قوتِ حافظہ کا چشمہ رواں ہو گیا اور ساری کتاب سنا ڈالی۔[2]

خطیب بغدادی اپنی تاریخ بغداد میں لکھتے ہیں کہ ادیب مشہور ابو عمر و زاہد، قاضی محمد کے صاحبزادے کو ادب کی تعلیم دیتے تھے۔ ایک روز اُنھوں نے اپنے شاگرد کو لغت کے تیس[۳۰] مسئلے اور اُن کے آخر میں دو شعر لکھوائے اتفاقاً اُسی دن عہد مذکور کے تین اُستاد کامل ابن دُرید، ابن انباری اور ابو بکر، قاضی ممدوح سے ملنے آئے (کثرت بیان کی وجہ سے بعض لوگ ابو عمرو کی نسبت یہ بدگمانی کرنے لگے تھے کہ وہ بہت سی باتیں طبعزاد بھی کہہ دیتے ہیں لہذا) قاضی صاحب نے وہ مسائل علمائے موصوف کی خدمت میں پیش کئے اور اُن کی تنقیح چاہی۔ ایک علامۂ وقت کے مسائل پر رائے زنی کرنا پوری ذمہ داری کا کام تھا۔ ابن انباری اور ابو بکر تو اپنے مشاغل کا عذر کر کے خاموش ہو رہے۔ ابن دُرید نے بیساختہ

---

[1] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۹ [2] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۳۰۹

کہا کہ ان مسائل کی لغت میں کوئی اصل نہیں، سب ابوعمرو کے گڑھے ہوئے ہیں۔ ابوعمرو کو یہ خبر پہنچی تو قاضی صاحب سے کہلا بھیجا کہ اپنے کتاب خانے میں سے فلاں فلاں شعرائے عرب کے دیوان نکلوا دیجئے۔ چنانچہ وہ سب دیوان نکالے گئے۔ ابوعمرو نے ایک ایک مسئلہ لے کر اُس کے شواہد اُن دیوانوں سے نکال نکال کر قاضی صاحب کو دکھلانے شروع کئے اور اس طرح تیسوں مسئلے اہل زبان کے کلام سے ثابت کر دئیے۔ دو شعر جو اخیر میں لکھوا دئیے اُن کی نسبت کہا کہ میرے اُستاد ثعلب نے فلاں روز آپ کے سامنے پڑھے تھے اور آپ نے فلاں کتاب کی پشت پر لکھ لئے ہیں۔ جب وہ کتاب دیکھی گئی تو فی الواقع وہ شعر اس پر ثبت تھے۔ ابن دُرید نے اس حال کو سُن کر پھر کبھی کوئی لفظ ابوعمرو کی نسبت زبان سے نہیں نکالا۔[۱]

متنبی شاعر مشہور سے ابوعلی فارسی امام نحو نے ایک بار پوچھا کہ فِعلیٰ کے وزن پر عربی زبان میں کتنے اسم جمع آئے ہیں۔ متنبی نے بے تامل کہا حِجلیٰ اور ظِربیٰ۔ ابوعلی نے تین شب متواتر لغت کی کتابیں چھانیں مگر تیسرا اسم جمع اُن کو اس وزن کا نہ ملا۔[۲]

جب حسن ابن سہل وزیر خلیفہ مامون الرشید عراق میں آیا تو اُس نے علمائے ادب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ حسب ایما اصمعی، ابوعبیدہ اور ابوبکر نحوی، بارگاہ وزارت میں حاضر ہوئے۔ اُن سے مخاطب ہونے سے پیشتر وزیر نے اُن عرائض پر دستخط کئے جو اہل حاجت نے پیش کی تھیں۔ جب ان عرضیوں پر جو شمار میں پچاس تھیں دستخط کر چکا تو علمائے ممدوح کی طرف متوجہ ہو کر معذرت کی اور سلسلۂ کلام شروع کیا۔ اثنائے کلام میں اُن بزرگانِ گزشتہ کا ذکر ہوا جن کی قوتِ حافظہ مشہور تھی اور امام زہری اور قتادہ کا ذکر ہونے لگا۔ ابوعبیدہ نے کہا حدیثِ زندہ گوئیم مردہ در گور۔ اس وقت یہاں ایسا شخص موجود ہے کہ کبھی کتاب کو

---

[۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹۱ [۲] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۶۔

ایک بار پڑھ کر دوبارہ دیکھنے کی اُس کو حاجت نہیں ہوئی اور جو بات ایک دفعہ اُس کے خزانہ حافظہ میں پہنچ گئی پھر نہیں نکلی یہ سُن کر اصمعی نے جسارت کر کے کہا کہ یہ میری طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان کے دعوے کو میں اس طرح ثابت کرسکتا ہوں کہ وزارت مآب نے جس قدر عرائض پر اس وقت دستخط فرمائے ہیں ان سب کا خلاصۂ مضمون اور دستخطوں کی اصل عبارت سنا دوں۔ وزیر کے حکم سے کل عرضیاں واپس آکر پیش ہوئیں۔ اصمعی نے بیان کرنا شروع کیا کہ فلاں عرضی کے پیش کنندہ کا یہ نام ہے اور یہ کام اور یہ دستخط اُس پر ہوئے۔ اسی طرح وہ نادرۂ روزگار بیان کرتا گیا۔ جب کچھ اوپر چالیس عرضیوں کی نوبت پہنچی تو حاضرین میں سے ابو نصر نے کہا کہ اصمعی خدا کے لئے اپنی جان پر رحم کرو کہیں نظر نہ لگ جائے۔ یہ سُن کر وہ چہکتا ہوا بلبل خاموش ہوگیا۔[1]

امام ابو سعد کو ساری صحیح مسلم۔ حافظ ابو الحسین اصفہانی کو صحیح بخاری و صحیح مسلم اور امام تقی الدین بعلبکی کو الجمع بین الصحیحین صحیح مسلم اور اکثر مسند امام احمد بر زبان تھی امام آخر الذکر ایک جلسے میں ستر حدیثیں حفظ کر لیتے تھے۔ ایک بار ایک دن سے کم میں انھوں نے مقامات حریری کے تین مقامے ازبر کر لئے۔[2] علامہ ابن ابی اصیبعہ مؤلف طبقات الاطبا نے ادویۂ مفردہ کے متعلق کچھ کتابیں مصنفہ ابن بیطار خود مصنف سے پڑھی تھیں۔ اپنے استاد کی تعلیم کا جو اسلوب انھوں نے طبقات میں لکھا ہے اُس سے علاوہ استحضار علمی کے یہ بھی آشکارا ہوتا ہے کہ اساتذۂ سلف کس طرح اپنے تلامذہ کو کامل بناتے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے اُستاد کے درس کے وقت بہت سی کتابیں مفرد دواؤں کے متعلق مثل کتاب حکیم دیسقوریدس، کتاب جالینوس، کتاب غافقی موجود رہتیں۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا

---

[1] ابن۔ ج ا۔ صفحہ ۲۸۶ [2] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۸۰۔ ۱۱۶۔ ۲۳۱

کہ اول ایک مفرد دوا کا یونانی نام (جو دیسقوریدس نے لکھا ہے) لیتے اُس کے بعد اُس کے معنی (جو انھوں نے روم میں رہ کر تحقیق کئے تھے) بیان کرتے۔ پھر جو کچھ طبیبوں نے اُس دوا کے افعال و خواص لکھے ہیں سُناتے۔ اسی طرح جالینوس اور متاخرین کے اقوال و مذاہب کا بہ ترتیب ذکر کرتے پھر اطبا کے باہمی اختلاف کی (دوائے مذکور کی نسبت) تشریح کرتے۔ آخر میں وہ غلطیاں ظاہر کرتے جو اطبائے مذکور سے اُس دوا کے متعلق سرزد ہوئی تھیں۔ اُستاد جب ان مدارج کو طے کر چکتے تو ہم محوّلہ کتابوں کو کھول کر دیکھتے اُن کے زبانی بیان اور کتابوں کے مضمون میں سرِ مو فرق نہ نکلتا۔ جب ہم کتاب دیکھتے تو ابن بیطار یہ بتاتے جاتے کہ دیسقوریدس نے فلاں مقالے میں اس دوا کا ذکر کیا ہے اور مقالۂ مذکور میں اس کا یہ نمبر ہے۔ اس قدر بیان پر علامہ استاد کو تسلی نہ ہوتی بلکہ جن نباتات کا ذکر درس میں ہوتا وقتاً فوقتاً جنگل میں لے جا کر اُن کا مشاہدہ بھی طلبہ کو کرا دیتے۔ جو اُستاد اپنے طلبہ کے سامنے بقراط اور جالینوس کی غلطیاں نکال کر رکھدے اُن کو کتاب کا کیڑا نہ بنائے بلکہ حقائق کے مشاہدے کا خوگر کرے اُس کے شاگرد بے شک کامل اور محقق ہونگے۔ جو لوگ جالینوس اور ارسطو کی عقل کو معصوم مان چکے انھوں نے تو گویا اپنی عقلوں کو یونانیوں کے ہاتھ بیچ ڈالا پھر کمال کیسا اور تحقیقات کجا۔[1]

امام داؤد ظاہری ناقل ہیں کہ میری محفل میں ایک روز ایک شخص ابو یعقوب بصری نامی شکستہ حال وارد ہوئے اور بدون کسی اشارے کے خود بخود صدر میں آبیٹھے اور فخریہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ سل یا فتی عما بدا لك (اے جوان تیرے دل میں جو آئے مجھ سے پوچھ لے) مجھ کو اُن کی اس مشیخت پر سخت غصہ آیا اور استہزاءً میں نے کہا کہ حجامت[2]

---

[1] عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ [2] پچھنے لگوانا

کی نسبت کچھ فرمائیے۔ ابویعقوب نے بارک اللہ کہا اور سب سے اول محدثانہ اور فقیہانہ گفتگو شروع کی۔ حدیث افطر الحاجم والمحجوم روایت کرکے بیان کیا کہ کس راوی نے اُس کو مسند اور کس نے موقوف اور کس نے مرسل روایت کیا ہے اور فقہا میں کس کس کا عمل اس پر ہے اس کے بعد انھوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھنے لگوانے کے مختلف طریقے بیان کئے اور اُس اُجرت کا ذکر کیا جو آپ نے حجام کو مرحمت فرمائی تھی اور یہ ثابت کیا کہ اگر اُجرت حجامت حرام ہوتی تو آپ مرحمت نہ فرماتے۔ پھر ایک اور حدیث کے طرق روایت سنائے جس کا مضمون یہ ہے کہ آں حضرت نے بھری شاخیں کھوائی تھیں۔ پھر اس باب کی تمام احادیث صحیحہ متوسطہ اور ضعیفہ کو علی الترتیب بیان کیا۔ اصول حدیث و فقہ کے مطابق اس قدر بحث کے بعد وہ طب کی طرف جھکے اور اطبا کی جو رائے حجامت کی نسبت مختلف زمانوں میں رہی ہے شرح کر سنائی۔ طب کے بعد تاریخ کا نمبر تھا آخر کلام میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ سب سے اول یہ عمل اصفہان میں ایجاد ہوا تھا۔ امام ظاہری فرماتے ہیں کہ میں یہ وسعت تقریر دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اور اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہا واللہ ما حقرت بعدك احدًا ابدًا یعنی میں بعد تمہارے کسی کو بہ نظر حقارت نہیں دیکھوں گا[۱]۔ مجدالدین فیروزآبادی صاحب قاموس نے ایک زمانے میں بیان کیا تھا کہ میں جب تک دو سو سطریں حفظ نہیں کرلیتا سوتا نہیں۔

قرامان واقع ملک روم میں جو مدرسہ بنام سلسلہ جاری تھا اس کے بانی کی جانب سے یہ شرط تھی کہ اُس کا مدرس وہ عالم مقرر کیا جائے جس کو صحاح جوہری ازبر ہو۔ چنانچہ مولانا جمال الدین اپنے عہد میں مدرسہ مذکور کے مدرس تھے[۲]۔

علم سے سیر نہ ہوتا | علامہ ابن العلا سے ایک بار کسی نے پوچھا کہ آدمی کو کب تک

---

۱ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۰۶ ۲ شق۔ ج ۱۔ صفحہ ۲ و ۳۳

علم حاصل کرنا چاہئے! اس عالی دماغ نے جواب میں کہا کہ مادامت الحیٰوۃ تحسن بہ یعنی
جب تک حیات مہربان رہی۔ دریائے علم ناپیدا کنار ہی اور انسانی زندگی محدود با ایں ہمہ اگر
آدمی کسی حد پر پہنچ کر علم سے سیر ہوجائے تو یہ اُس کی حرماں نصیبی ہی۔ شوق کا تقاضا یہ ہی ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اور یہ محض دل خوش کن خیال نہیں ہی۔ آپ میدانِ علم میں ایسے جوان مرد پائینگے جنھوں نے
اس قول کو دم واپسیں تک عزیز رکھا اور دکھلا دیا کہ جب اجل کا فرشتہ اُن کی جانِ شیریں
تن سے جدا کر رہا تھا وہ علم کی خدمت میں مشغول تھے اور سچ یہ ہی کہ جب علم محدود نہیں تو طلب
کی بھی کوئی حد نہ ہونی چاہئے کسی کمال کے طالب کا یہ خیال کر لینا کہ میں حدِ طلب کو پہنچ چکا
سمِّ قاتل ہی۔ یہ مسئلہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہی کہ عالم میں کسی حالت کو وقوف نہیں ہی یا ترقی ہی
یا تنزل۔ پس علمی عروج میں بھی جس زینے پر طالب کا قدم رکا وہیں سے اُس کا تنزل شروع ہوجائیگا
اور جب تک اُس کے ذہن میں اپنی نادانی کا خیال راسخ اور اُس کی ہمت کا مقولہ "پیش"
رہیگا، میدان طلب میں فتح و فیروزی نصیب ہوتی جائیگی۔ سقراط کا مقولہ ہی کہ میرے علم کی
معراج یہ ہی کہ میں نے سمجھ لیا ہی کہ مجھ کو کچھ نہیں آتا۔ دیارِ مغرب کا ایک حکیم دانا جب بسترِ نزع پر
دم توڑ رہا تھا تو اُس نے کہا کہ دنیا میرے علم کی نسبت معلوم نہیں کیا کیا گمان کر رہی ہوگی
مگر میں اپنے آپ کو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک نافہم بچہ سمندر کنارے چند خزف پاروں سے کھیل رہا
ہی اور علم کا ناپیدا کنار سمندر اُس کے سامنے موج زن ہی۔ بیشک اگر ان حکما کا یہ دلی عقیدہ
نہ ہوتا تو ہرگز وہ علمی مراتب پر سرفراز نہ ہوتے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہرچہ بروے می رسی بروے مایست

امام ابن السنی کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ایک روز لکھتے لکھتے

قلم دوات میں رکھا اور دعا کو ہات اُٹھائے۔ جو ہات دعا کے واسطے اُٹھے تھے پھر وہ قلم نہ اٹھا سکے اور عینِ حالت دعا میں روح عالمِ بالا کو پرواز کر گئی۔ ابن السنی کا سن اُس وقت اسّی برس سے متجاوز ہو چکا تھا[۵۱]۔ حافظ ابن مندہ کا بیان ہے کہ اُن کے والد جب دنیا سے رحلت کر رہے تھے تو حافظ ساجی اُن کے سامنے غرائب شعبہ کی قرأت میں مصروف تھے[۵۲]۔ امامِ ادب ابو العباس ثعلب کی وفات کے واقعے سے زیادہ موثر مثال اس مبحث میں مشکل سے ملیگی۔ ثعلب کی عمر اکانوے برس کی ہو چکی تھی کہ ایک دن جمعے کے بعد مسجد سے مکان کو جانے لگے راستے میں کتاب دیکھتے جاتے تھے۔ کتاب میں محویت اور اُس پر ثقل سماعت پھر آواز کیا سنتے ایک گھوڑے کا دھکا لگا اور اُس کے صدمے سے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ لوگ غشی کی حالت میں اٹھا کر مکان پر لائے۔ ضعفِ پیری اتنے بڑے صدمے کو کب برداشت کر سکتا تھا اُسی حال میں رحلت کی۔ انتہائے پیری میں بھی اُن کا شوقِ طلب اتنا قوی تھا کہ رہ نوردی میں جو وقت گزرتا اُس کا جاتا رہنا بھی گوارا نہ ہوا ؎

چہ حالت ست ندانم جمالِ سلمارا   کہ بیش دیدنش افزوں کند تمنا را

اور سچ یہ ہے کہ اگر یہ علمی تشنگی نہ ہوتی تو ابو العباس ادب میں امامت کے درجے کو نہ پہنچتے[۵۳]۔ انسان جب کسی پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس سے معمولی کام بھی نہیں ہو سکتے لیکن طلب صادق میں یہ کرامات ہے کہ وہ پریشانی کو بھی جمعیت کے قالب میں لے آتی ہے۔ علمائے سلف نے پریشان خاطری کی حالت میں وہ وہ کام کئے ہیں کہ زمانہ آج تک اُن پر آفریں کر رہا ہے۔ ابو تمام طائی شاعر مشہور ایک مرتبہ خراسان کے دربار کو جا رہا تھا۔ ہمدان پہنچ کر موسم سرد مہری سے پیش آیا اور برف اس کثرت سے پڑی کہ تمام راستے بند ہو گئے اور ابو تمام کو چندے وہیں قیام کرنا پڑا۔ حالتِ

---

۵۱ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۵۱   ۵۲ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۴۴   ۵۳ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۰

سفر میں ایسا حرج واقع ہونے سے جو پریشانی طبیعت کو ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مگر ہمارے زندہ دل شاعر کی خاطر جمع تھی۔ جس رئیس کا وہ مہمان تھا اس کے کتاب خانے میں دواوین عرب بکثرت تھے ابوتمام نے موقع کو غنیمت سمجھ کر سب دیوان پڑھے اور ان میں سے اشعار انتخاب کر کے نظم عربی کا ایک بے بہا مجموعہ تیار کر لیا جو آج تک حماسہ کے نام سے سارے عالم میں مشہور ہے۔[1]

شیخ الرئیس سے ایک زمانے میں حکام وقت برہم تھے اور جان کے خوف نے اُس کو روپوش کر رکھا تھا اسی تباہ حالی میں کچھ دن کے لئے اُسے ایک عطّار کے گھر میں پناہ مل گئی۔ اتنا سا اطمینان پا کر شیخ کو اپنے علمی مشاغل یاد آئے اور عطّار سے سامانِ تحریر منگوا کر تصنیف شروع کر دی۔ یہ کوئی معمولی تصنیف نہ تھی بلکہ شیخ اپنی کتاب شفا کو تمام کر رہا تھا۔ طرز تصنیف یہ تھا کہ اول رؤس مسائل اپنی یاد سے ایک جزیرے لکھے اُس کے بعد اُن مسائل کی تشریح کی۔ اس طرح فنِ طبعیات و الٰہیات ختم کر دیئے۔ فنون حکمیہ میں کتاب حیوان و کتاب نبات اگرچہ باقی تھی لیکن شیخ اُن کو چھوڑ کر فنِ منطق لکھنے لگا۔ ہنوز منطق تحریر ہو رہی تھی کہ قضیہ دگرگوں ہو گیا۔ کسی مخبر نے حاکم کو خبر کر دی اور اُس نے شیخ کو گرفتار کر کے قلعہ فروجان میں بھیج دیا۔ اُس بلند اور استوار حصار میں شیخ کا جسم بے شک مقید تھا۔ لیکن اُس کے علمی شوق کو کوئی دنیاوی طاقت مقید نہیں کر سکتی تھی۔ اُسی زندان میں کتاب الہدایات رسالہ حی ابن یقظان اور کتاب القولنج تصنیف کر ڈالیں۔ اس وقت کے لوگ اگلے زمانے کو ایک بہشتی زمانہ تصور کر رہے ہیں جب میں علما کے واسطے در و دیوار اور زمین و آسمان سے اطمینان و فارغ البالی برستی تھی اور اُن کا یہ گمان بلکہ بدگمانی ہے کہ جو نمایاں کام اسلاف نے کئے وہ یہی فراغ خاطر کی بدولت تھے۔ حالانکہ واقعات اس کی تردید کر رہے ہیں۔ کیا حکایت بالا کو پڑھ کر کسی

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۶۱

دل میں یہ تمنا پیدا ہو گی کہ کاش اُس کو شیخ الرئیس کا سا اطمینان نصیب ہوتا۔ اگر شیخ نجات اور فراغ خاطر کا منتظر رہتا تو دنیا کو شفا وغیرہ بے بہا تصانیف کب میسر آتیں[۵۱]۔ شیخ ابن جوزی ایک زمانے میں واسط میں نظر بند تھے یہ وہ وقت تھا کہ چار دانگ عالم کو اُن کی امامت و جلالت مسخر کر چکی تھی حسنِ اتفاق سے ابن باقلانی بھی اُن دنوں واسط میں تھے۔ ابن جوزی نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور اُن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ شیخ کے صاحبزادے یوسف باپ کے ہم سبق تھے۔ اس واقعے کی جان یہ ہے کہ سبق خوانی کے وقت امام ابن جوزی کی عمر اسّی برس کی تھی[۵۲]۔ شمس الائمہ سرخسی نے جو کتاب علم اصول میں تصنیف کی ہے اُس کا لکھنا خوارزم کے قید خانے میں شروع کیا تھا۔ باب الشروط تک حالت قید میں لکھی۔ رہائی پا کر فرغانہ میں ختم کی[۵۳]۔

علامہ اثیر الدین ابہری کی نسبت بیان ہے کہ اگرچہ علم و فضل میں اس پایہ کو پہنچ گئے تھے کہ خود اُن کی تصانیف ملک میں مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ تاہم اساتذہ کے سامنے کتاب لے کر بیٹھنے میں اُن کو عار نہ تھی۔ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ خود میں نے اُن کو اس حالت کمال میں کمال الدین شافعی سے مجسطی پڑھتے دیکھا تھا[۵۴]۔ امام داؤد ظاہری کی مجلس میں چار سو عالم صاحب طیلسان حاضر ہوتے تھے اور شیخ ابوحامد اسفرائنی کے درس میں تین سو تک فقہا شمار کئے گئے[۵۵]۔

امام نحو یونس نے اٹھاسی برس کی عمر پائی۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ساری عمر اُنھوں نے شادی نہیں کی اور مرتے دم تک اُن کے پیشِ نظر سوائے طلب علم اور مذاکرۂ علمیہ کے کچھ نہیں رہا[۵۶]۔

بذلِ اموال | افلاس کی حالت میں علمائے کرام کی ہمت کا جو عالم رہا اُس کو ہم مفصل گزارش

---

۵۱ عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۲ ۵۲ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۴۰ ۵۳ کشف الظنون۔ ج ۲ صفحہ ۱۱۴

۵۴ ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۳ ۵۵ ابن۔ ج ۲ صفحہ ۱۹ و ۱۷۶ ۵۶ ابن۔ ج ۲ صفحہ ۴۱۶

کر چکے ایک دوسرا پہلو دیکھنا ابھی باقی ہے یعنی دولت و تمول کا جس کی نسبت مشہور ہے ؎

چون بدولت برسی مست نگردی مردی | با دہا خوردن و ہشیار نشستن سہل ست

اثر اُن کے علمی شوق پر کیا پڑا۔ افلاس انسان کے حوصلے کو پست کرتا ہے اور دولتمندی قوائے دماغی کو کند اور سست کرنے والی ہے جس طرح افلاس میں مستقل مزاج رہنا دشوار ہے اسی طرح نشۂ دولت میں اپنے آپ کو سنبھالے رکھنا مشکل ہے۔ اگر واقعات یہ ثابت کر دیں کہ علمائے سلف ثروت میں بھی ویسے ہی طالب علم تھے جیسے افلاس میں تو یہ کہا جائے گا کہ اُنھوں نے علم کے دو زبردست دشمنوں کو اپنی مردانہ ہمت سے زیر کر لیا تھا۔ علی ابن عاصم بیان کرتے ہیں کہ ابتدائے طالب علمی میں میرے والد نے ایک لاکھ درہم مجھ کو دیئے اور کہا کہ بیٹا یہ لاکھ درہم لو اور علم کی تحصیل میں صرف کرو۔ مگر یہ یاد رہے کہ ان لاکھ درہموں کا معاوضہ ایک لاکھ حدیثوں سے ہو گا۔ علی ابن عاصم نے باپ کی توقع کو ضائع نہیں کیا۔ اُن کے محدثانہ کمال کا یہ شاہد عدل ہے کہ اُن کو دربارِ علم سے مسندِ عراق کا خطاب عطا کیا گیا[1] ہشام ابن عبید اللہ نے (جو شوقِ طلب میں سترہ سو شیوخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے) سات لاکھ درہم راہِ طلب میں صرف کئے۔ اسی طرح ابن متوکل بخاری نے اسی ہزار درہم حافظ کبیر ابن سنجر نے نو ہزار اشرفیاں۔ حافظ ابن رستم نے تین لاکھ درہم اور امام ذہبی نے ڈیڑھ لاکھ درہم طلب علم میں صرف کئے[2]

ابوبکر جوزقی کی نسبت روایت ہے کہ اُنھوں نے طالب علمی میں ایک لاکھ درہم خرچ کئے اور جس فن کو اتنا گراں خریدا اس کو کبھی سستا نہیں بیچا یعنی اُس کے ذریعے سے کبھی دنیا نہیں کمائی[3]۔ ابو یوسف سدوسی حافظ علامہ جن کی مسند کبیر فن حدیث میں ایک گراں مایہ

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۸۹ [2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۵۵ و ج ۲ صفحہ ۱۰ و ۱۵۶ و ۱۱۴ و ۱۸۳ [3] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۱۹

کتاب ہی۔ بہت متمول اور با ثروت تھے چالیس کاتب اُن کی سرکار میں شب و روز کتابوں کی نقل کے واسطے حاضر رہتے۔ اگلے علما جس حوصلہ اور ہمت سے کتابیں تصنیف کرتے تھے وہ اس سے عیاں ہی کہ جس مسند کو کبیر کا خطاب ملا ہی اُس کی تیاری اور تکمیل میں دس ہزار اشرفیاں صرف ہوئی تھیں[۵۱]۔ ابو مسلم صاحب سنن نے اول مرتبہ روایت حدیث کرنے کی خوشی میں دس ہزار درہم خیرات کئے۔ فاروق خطابی اُن کے ایک شاگرد راوی ہیں کہ جب ہم لوگ اُن سے سنن سُن کر فارغ ہوئے تو ہماری ضیافت انھوں نے بڑی دھوم سے کی جس میں ایک ہزار اشرفیاں خرچ ہوئیں[۵۲]۔ اسی طرح جب ابن احمد ہمدانی نے پہلی بار اپنے وطن ہمدان میں املائے حدیث کیا تو سات سو اشرفیاں طلبائے حدیث کی نذر کیں[۵۳]۔ شاہ عبد العزیز صاحب حافظ ابن حجر عسقلانی کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ جب حافظ ممدوح بخاری کی شرح فتح الباری کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اس مسرت میں انھوں نے ایک شاندار دعوت پانسو اشرفی لگا کر کی[۵۴]۔ دارقطنی کے اُستاد امام دعلج کی سرکار سے محدثین مکہ مکرمہ و عراق و سجستان کے وظائف مقرر تھے[۵۵]۔ امام لیث حافظ ابو عبد اللہ رازی اخیر دفعہ بصرے گئے تو صرف کاتبین کی اُجرت کی بابت دس ہزار درہم ادا کئے[۵۶]۔

مسلمانانِ سلف میں عموماً علمی ذوق

علمائے سلف کی علمی شیفتگی سے بحث کرنے کے بعد غالباً ایک نظر اُس زمانے کے عام اہلِ اسلام کی علمی حالت پر ڈالنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس دور شائستگی میں جس طرح ہر شائستہ ملک و ملت کے فی صدی تعلیم یافتہ آدمیوں کی صحیح تعداد آئینہ ہو رہی ہی اُس طرح ہم اگلے زمانے

---

[۵۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۵۵ [۵۲] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۹۵ [۵۳] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۱۹۴ [۵۴] بستان صفحہ ۱۲۸
[۵۵] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹ [۵۶] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶

کے خواندہ مسلمانوں کا ٹھیک شمار پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مگر بہت سے واقعے کتابوں میں ایسے ملتے ہیں جن کی مدد سے قیاس اپنا کام کر سکتا ہی اور ایک تخمینی حالت پچھلے مسلمانوں کے بکثرت تعلیم یافتہ ہونے کی ہمارے ذہن میں پیدا ہو سکتی ہی۔ اس مبحث کو ہم تین حصّوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ عامۂ مسلمین[1] میں علم کا شوق اور رواج بیبیوں[2] میں علم کا چرچا۔ امرا[3] میں علم۔

عامۂ مسلمین میں علم کا شوق اور رواج

عامۂ اہل اسلام میں علمی رواج و مذاق کا پتا لگانے کے تین ذریعے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اولاً ان حاضرین کی تعداد جو ایک ایک حلقۂ درس میں شامل اور حاضر ہوتے تھے ثانیاً اُن اہل کمال کا شمار جو ایک ایک شہر میں تھے۔ ثالثاً چند متفرق حکایتیں۔

یحیٰی ابن جعفر بغدادی بیان کرتے ہیں کہ علی ابن عاصم کے حلقۂ درسِ حدیث میں تیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا تو اُس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا۔ ایک مرتبہ سلیمان ابن حرب کے واسطے بغداد میں قصر خلافت کے قریب ایک مرتفع جگہ مثل منبر تیار کی گئی تاکہ اُس پر بیٹھ کر املاے حدیث کریں۔ اُس مجلس میں امیر المومنین مامون الرشید اور تمام امراے خلافت حاضر تھے جو لفظ امام ممدوح کے منھ سے نکلتا اُس کو امیر المومنین اپنے قلم سے لکھتے جاتے۔ جب کل حاضرین درس کا تخمینہ کیا گیا تو چالیس ہزار نفوس اندازے میں آئے۔ امام عاصم ابن علی املائے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں۔ ایک بلند چبوترے پر بیٹھتے تھے اُن کے مستملی ہارون نے اپنے کھڑے ہونے کے واسطے ایک خمدار کھجور کا درخت پسند کر رکھا تھا۔ خلیفہ معتصم باللہ نے ایک بار ایک اپنا معتمد اُس مجلس کے شرکا کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا۔ معتمد نے ارشاد خلافت کی تعمیل کی تو ایک لاکھ بیس ہزار پر حاضرین کی تعداد پہنچی جس قوم کے افراد ایک ایک

مجلس علمی میں سوا سوا لاکھ جمع ہو جائیں قیاس کیجئے کہ اُس قوم کے سینے میں کتنا شوقِ علم ٹھاٹھیں مار رہا ہوگا اور جو شہر اپنے سوا سوا لاکھ باشندے ایک جلسۂ علمی میں بھیج دے وہ کتنا آباد ہوگا۔[1]

یہ واقعات پڑھنے کے بعد یہ سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان مجالس کے حاضرین کے شمار کرنے کا کیا طریقہ تھا اور حقیقۃً ان روایتوں پر وثوق اس طریقے کی صحت و عدم صحت پر موقوف ہے۔ ذیل کا واقعہ اس سوال کا جواب دے گا۔ احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رحبۂ غسان نامی مقام پر اُنھوں نے حدیث کا املا کیا۔ سات مستملی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے تحریرِ حدیث میں مصروف تھے یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ کس قدر آدمی اُس وسیع میدان میں فراہم تھے میدان مذکور کی پیمائش کی گئی اور دواتیں گنی گئیں کچھ اوپر چالیس ہزار دواتیں ہوئیں جو لوگ لکھتے نہ تھے صرف سماعاً شریک تھے وہ اس تعداد سے خارج ہیں۔ جب شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املاے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی اُن کی مجلس میں حاضر تھے۔ اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار۔ ابو الفضل راوی ہیں کہ جب میں نے فریابی سے حدیث سنی ہے تو قریباً دس ہزار آدمی اُن کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے جو دوات قلم لے کر بیٹھتے۔ امام ذہبی ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری میں یہ شوق اپنے رسول پاک کے اقوال و احوال کا اہل اسلام میں تھا کہ ایک ایک مجلس میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔[2] امام بخاری کے صرف ایک شاگرد فربری سے نوّے ہزار آدمیوں نے صحیح بخاری کی اجازت حاصل کی تھی۔[3] جب فرّاتے اپنی تصنیف کتاب المعانی (فنِ ادب) کا املا کیا تو لوگوں نے حاضرین کا شمار کرنا چاہا مگر بوجہ ہجوم کے نہ کر سکے۔ صرف قاضیوں کو

---

[1] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۹۰۔ ۳۶۰۔ ۳۶۴ [2] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۱۹۶۔ ۲۱۰۔ ۲۶۴ [3] مقدمہ صفحہ ۵۸۰

گنا تو اسّی تھے۔[1] دوسرا ذریعہ عامّہ مسلمین میں علم کی کثرت دریافت کرنے کا اُن باکمالوں کی تعداد ہے جو ایک ایک شہر میں ایک ہی وقت میں موجود تھے۔ جب اس بات پر لحاظ کیا جائے کہ فی صدی کتنے طلبہ اعلیٰ تعلیم تک پہنچتے ہیں اور پھر اعلیٰ تعلیم تک پہنچنے والوں میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو علم وفن کی خدمت کے لئے وقف کرکے کمال حاصل کرتے ہیں تو بے شک باکمالوں کی تعداد مسلمانوں میں علم کے عام اور شائع ہونے کی شہادت بن سکے گی۔ ذیل کے واقعے صرف ایک ایک فن کے کملا بتلاتے ہیں۔ مگر قیاس کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ جس شہر میں نوسو سے زیادہ سند یافتہ طبیب ہونگے اس میں کتنے محدّث ہونگے۔ کس قدر ادیب اور کتنے مہندس وغیر ذلک۔ پس اولاً ذہن میں کل فن کے باکمالوں کی تعداد ایک فن کے باکمالوں پر قیاس کرکے قائم کیجئے پھر یہ سوچئے کہ کتنے پڑھنے والوں میں ایک باکمال پیدا ہوتا ہے تو عامّۂ مسلمین میں کثرت تعلیم کا ایک اجمالی مفہوم ضرور آپ کے ذہن میں قائم ہوسکے گا۔

مسلم ابن ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا ہے اور باوجود شیوخ کی اس کثرت کے میں پل[2] اتر کر نہیں گیا یعنی ایک ہی شہر میں آٹھ سو اساتذۂ حدیث ان کو ایسے مل گئے جو شیخ کا لقب حاصل کرچکے تھے۔[3] ۳۱۹ھ میں خلیفہ عباسی مقتدر باللہ کو یہ سن کر سخت افسوس ہوا کہ شہر بغداد میں ایک شخص کی جان کسی طبیب کے جہل مرکب کی نذر ہوگئی۔ آیندہ کی انسداد کے لئے رئیس الاطبا ابن ثابت کے نام یہ حکم صادر کیا گیا کہ تمام اطبائے بغداد کا امتحان لیا جائے جو امتحان میں کامیاب ہوں اُن کو سند عطا ہو اور جو ناکامیاب رہیں اُن کو علاج سے روک دیا جائے۔ بغرض مزید احتیاط سند میں اس امر کی تشریح بھی ہو کہ دارندۂ سند کو فلاں فلاں قسم کے امراض کے معالجے کی اجازت ہے تاکہ وہ انھیں امراض کا

---

[1] ابن۔ ج ۲ صفحہ ۲۲۸ [2] غالباً بغداد کا پل جو دجلے پر تھا [3] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۶۱

علاج کر سکے جن سے اُس کو پوری واقفیت ہو۔ ابن ثابت نے فرمانِ خلافت کی تعمیل کی اور کُل اطبائے دار السلام کا امتحان لیا۔ کیا یہ حیرت خیز بات نہیں ہے کہ بعد امتحان دار الخلافہ کے دونوں حصّوں میں جن اطبا کو سندِ علاج عطا ہوئی اُن کی تعداد کچھ کم نو سو تھی۔ مزید برآں وہ اطبا اس شمار سے خارج ہیں جو بوجہ شہرتِ فضل و کمال امتحان سے مستثنیٰ رہے یا جن کو سرکار خلافت میں تعلق حاصل تھا۔ خدا کو علم ہے کہ ایسے طبیب کتنے تھے اور اُن کی تعداد نو سو کے عدد کو کہاں تک بڑھا دیتی۔[1] امام ادب نضر بن شمیل جب بصرے سے خراسان کو جانے لگے تو تین ہزار آدمی شہر سے اُن کی مشایعت کو ایسے نکلے جو یا نحوی تھے یا لغوی عروضی تھے یا محدّث یا اخباری۔[2]

کیا ہم اُنھیں اسلاف کے خلف ہیں جن میں کمال کی یہ کثرت تھی۔ ہماری پست حالت تو ان واقعات کو بھی رستم و اسفندیار کے افسانوں کے پہلو بہ پہلو بٹھانے پر آمادہ ہے جیسے تین ہزار اہلِ بصیرت ایک شہر بصرے سے باہر آئے تھے ویسے تین بھی آج تمام دنیائے مسلمین میں یقیناً نہیں نکلیں گے جس قوم میں یہ قحط رجال ہو اُس کے اگلے شہروں کی یہ مردم خیزی محال تو بے شک نہیں گو بعید از حال و خیال تو ضرور ہے۔

تیسرا ذریعہ یہ متفرق واقعے ہیں جن سے ایک نہ ایک پہلو سے ہمارا مدعا عیاں ہوتا ہے۔ ابن الاعرابی کوفی نے ایک روز اپنے درس میں دو آدمیوں سے جو باہم باتیں کر رہے تھے اُن کا وطن دریافت کیا۔ ذرا غور سے سُنئے کہ ایک نے اپنا وطن اسبیجاب (متصل سرحد چین) بتلایا دوسرے نے اسپین! ابن الاعرابی کو اس خیال سے حیرت ہوئی کہ کس قدر دُور و دراز ملک کے باشندوں کو شوقِ علم کی کشش اُن کی مجلس میں کھینچ لائی تھی۔ امام ابو العباس

---

[1] عیون۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۲۲ [2] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۶۱

نے ایامِ طالب علمی میں اپنی والدہ سے اجازت چاہی کہ امام قتیبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیضیاب ہوں مگر اجازت نہ ملی اور انھوں نے عزم فسخ کر دیا۔ جب اُن کی والدہ رحلت فرما گئیں تو بلخ پہنچے قتیبہ اُن کے پہنچنے سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ کسی جلیل القدر اُستاد کے فیض سے محروم رہ جانا اُن دنوں دُنیائے اسلام میں ایک ایسی مصیبت عظمیٰ سمجھی جاتی تھی کہ لوگ ابوالعباس کے پاس اُن کی محرومی کی تعزیت کرنے آتے تھے[۵۱]۔ حافظ کبیر ابونعیم کی کتاب الحلیہ کا پہلا نسخہ جب نیشاپور پہنچا تو وہاں اس کی یہ قدر ہوئی کہ چار سو اشرفی کو بکا[۵۲]۔ علامۂ محدّث ابن فطیس قرطبی کی کتابیں اُن کی وفات کے بعد بیچی گئیں تو چالیس ہزار اشرفیوں میں فروخت ہوئیں[۵۳]۔

بیبیوں میں علم کا ذوق جن کتابوں کی مدد سے ہم نے یہ اوراق مرتب کئے ہیں وہ عورتوں کے تعلیمی حالات سے اور بھی خاموش ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے کچھ واقعات متفرق ایسے ملے ہیں جو صاف کہہ رہے ہیں کہ ہماری ترقی کے دَور میں انسانی صنفِ نازک بھی ایک علمی شان و مرتبہ رکھتا تھا اور جو کمالات اگلے مسلمان حاصل کرتے تھے اُن میں اُن کی ماؤں اور بہنوں کی مدد غیر معتدبہ نہیں ہوتی تھی۔ امام حافظ ابن عساکر مؤرخ دمشق نے جن اساتذہ سے فن حدیث حاصل کیا تھا اُن میں اسّی سے زیادہ عورتیں تھیں[۵۴]۔ حافظ ابن حجر تو الی التاسیس میں اپنے شیوخ میں متعدد جگہ بیبیوں کا نام لیتے ہیں حفید ابن زہر اشبیلیہ کے طبیب مشہور کی بہن اور بھانجی طب اور معالجات کی عالمہ تھیں اور امراض نسائی کے معالجے میں بالخصوص اُن کو مہارت تامہ حاصل تھی۔ خلیفہ منصور (فرمان روائے اندلس) کے محلات کا علاج اُن کے سپرد تھا۔ اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جیسے

---

[۵۱] تذ۔ج ۲۔صفحہ ۲۱۴ [۵۲] تذ۔ج ۳ صفحہ ۲۹۳ [۵۳] تذ۔ج ۳ صفحہ ۲۶۲ [۵۴] تذ۔ج ۴۔صفحہ ۱۲۳

عموماً گھر کی بڑی بوڑھیاں عورتوں اور بچوں کے علاج کر لیا کرتی ہیں ایسی ہی ابن زہر کی بہن اور بھانجی بھی ہونگی۔ مؤرخ ابن ابی اصیبعہ جو علاوہ علامۂ وقت ہونے کے اعلیٰ درجہ کے طبیب بھی تھے اپنی تاریخ میں ان کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں۔ "وَكَانَتْ أُخْتُهُ وَابْنَتُهَا هٰذِهٖ عَالِمَتَيْنِ بِصِنَاعَةِ الطِّبِّ وَالْمُدَاوَاةِ وَلَهُمَا خِبْرَةٌ جَيِّدَةٌ بِمَا يَتَعَلَّقُ بِمُدَاوَاةِ النِّسَاءِ"[۵۱] یعنی اُس کی (ابن زہر کی) بہن اور بھانجی فن طب و معالجات کی عالمہ تھیں اور مستورات کے علاج میں یدطولیٰ رکھتی تھیں۔ امام یزید ابن ہارون کو آخر عمر میں ضعف بصارت نے کتاب بینی سے معذور کر دیا تھا۔ ان کی جاریہ اُس مصیبت میں اُن کے کام آتی اور وقت ضرورت کتابیں دیکھ کر اُن کے لئے حدیثیں یاد کر لیتی[۵۲] ابن سماک کوفی نے (جو اپنے عہد میں مشہور عالم تھے) ایک مرتبہ تقریر کرنے کے بعد اپنی جاریہ سے پوچھا کہ میرا طرز بیان کیسا ہے؟ سخن شناس جاریہ نے کہا کہ تقریر تو اچھی ہے لیکن اتنا نقص ہے کہ تم ایک ہی بات کو بار بار کہتے ہو۔ ابن سماک "میں اعادۂ کلام اس لئے کرتا ہوں کہ جو مخاطب اوّل مرتبہ نہ سمجھے ہوں وہ بھی سمجھ جائیں"۔ جاریہ "جب تک کم فہم سمجھیں گے، سمجھنے والے مکدر ہو چکیں گے"[۵۳] امام ابن جوزی کو اُن کے والد تین برس کا چھوڑ کر رحلت کر گئے تھے۔ باپ کے بعد یتیم بچے کی پرورش کی کفیل پھوپھی ہوئیں۔ ابن جوزی کی بہت چھوٹی عمر تھی کہ اُن کی پھوپھی اُن کو علما کے حلقۂ درس میں لے جاتیں تاکہ بچپن ہی سے اُن کے کان علمی باتوں سے آشنا ہو جائیں اس حفظ اوقات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابن جوزی دس برس کی عمر میں وعظ فرمانے لگے اور بڑھ کر دنیا کے ایک جلیل القدر امام ہوئے[۵۴] امام ربیعۃ الرائے (اُستاد امام مالکؒ و خواجہ حسن بصری) کے والد فروخ خلافت بنی اُمیہ کے عہد میں لشکر میں ملازم تھے جس زمانے میں امام ممدوح

---

۵۱ عیون۔ ج ۲۔ صفحہ ۷۰۔ ۵۲ تذ ج ۱۔ صفحہ ۲۹۲۔ ۵۳ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۹۱ ۵۴ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۳۶ و ۱۳۷

اپنی والدہ کے بطن میں تھے اُس وقت خراسان کو ایک لشکر خلیفۂ دمشق کی جانب سے روانہ کیا گیا اور فروخ کی خدمت اس لشکر کے سپرد ہوئی۔ وہ دور اسلامی فتوحات کا دور تھا اور مسلمان فرماں رواں بر و بحر کو اسلامی پرچم کے نیچے لانے کا تہیہ کر لیے تھے۔ فروخ کو خراسانی مہم میں ستائیس برس لگ گئے۔ جب وہ لوٹے تو جس بچے کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ گئے تھے وہ بڑا ہو کر امام وقت بن چکا تھا۔ قصہ مختصر فروخ لوٹ کر اپنے وطن مدینہ منورہ کو آئے اور گھوڑے پر سوار نیزہ ہات میں لئے گھر پہنچے اور دروازہ کو نیزے کی انی سے کھٹ کھٹایا۔ ربیعہ نے جو کھٹکا سُنا تو دروازہ کھولا اور باہر آئے۔ اگرچہ باپ نے بیٹے کو نہیں پہچانا مگر گھر اُن کا تھا۔ دروازہ کھلنے پر بے تکلف اندر جانے لگے۔ ربیعہ کو یہ دیکھ کر وحشت ہوئی اور للکار کر کہا کہ یَا عَدُوَّ اللّٰہِ تو میرے مکان میں کس طرح گھسا پڑتا ہے۔ سپاہی منش فروخ کو جن کی رگوں میں فتح کا جوش تازہ تھا یہ سُن کر طیش آیا اور کہا کہ خدا کے دشمن میری حرم سرا میں تیرا کیا کام۔ غرض بات بڑھی اور خدائی پنج پڑوسی جمع ہو گئے۔ امام مالک بھی اُستاد کا معاملہ سمجھ کر تشریف لائے آئے اور مُصلحانہ لہجے میں فروخ سے کہا کہ بڑے میاں آپ کو ٹھہرنا ہی مقصود ہے تو دوسرا مکان موجود ہے۔ امام صاحب کی نرمی نے فروخ کے دل پر اثر کیا اور کہا کہ جناب میرا نام فروخ ہے اور یہ مکان میرا ہے۔ ربیعہ کی والدہ نے نام سُن کر پہچانا اور کہا کہ یہ تو ربیعہ کے باپ ہیں۔ اب تو باپ بیٹے گلے ملے اور مل کر خوب روئے۔ دلوں کی حرارت جب رونے سے کم ہوئی تو دونوں گھر میں آئے اور اندر آ کر پھر جوش محبت میں صاف دل باپ نے بی بی سے پوچھا کہ یہ میرا ہی بیٹا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ فروخ جب اطمینان سے بیٹھ لئے تو اُنکو وہ تیس ہزار اشرفیاں یاد آئیں جو چلتے وقت بی بی کو دے گئے تھے اور اُن کی نسبت استفسار کیا۔ زیرک بی بی

نے کہا کہ گھبرائیے نہیں بہ حفاظت سے رکھی ہیں۔ ربیعۃ الرائے اس عرصے میں مسجد نبوی میں جا کر اپنے حلقۂ درس میں متمکن ہوئے جس میں امام مالک اور خواجہ حسن بصری سے اعیان شامل تھے تلامذہ کا یہ ہجوم تھا کہ چاروں طرف سے شیخ کو گھیرے ہوئے تھے۔ فروخ جو نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو وہاں یہ عالم دیکھا کہ اور دیر تک شوق سے اس مجمع کو دیکھتے رہے۔ ربیعہ اُس وقت سر جھکائے ہوئے تھے اور سر پر اونچی ٹوپی تھی۔ اس لئے باپ کو ایک دفعہ بھر بیٹے کے پہچاننے میں دقت ہوئی اور اُنھوں نے متعجب ہو کر لوگوں سے پوچھا کہ یہ شیخ کون ہیں سامعین نے جواب دیا ربیعہ ابن عبدالرحمٰن۔ فروخ کی اُس وقت کی مسرت کا اندازہ سوائے عالم الغیب کے کون کر سکتا ہے۔ فرطِ مسرت میں اُن کی زبان سے بے اختیار نکلا "لَقَدْ رَفَعَ اللّٰهُ ابْنِیْ"۔ جب خوش خوش گھر آئے تو بی بی سے سارا ماجرا بیان کیا۔ بی بی نے کہا کہ آپ کو کیا زیادہ پسند ہے۔ بیٹے کی یہ شان یا تیس ہزار اشرفیاں شوہر نے کہا کہ واللہ میں اس شان کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ بی بی "میں نے وہ اشرفیاں ربیعہ کی تعلیم میں صرف کر دیں"۔ زندہ دل شوہر وَاللّٰهِ مَا ضَيَّعْتِهَا (قسم رب کی تم نے وہ مال ضائع نہیں کیا) اس واقعہ میں یہ امر قابل غور ہے کہ ایک بچہ باپ کی تربیت سے محروم ہو کر ماں کی حفاظت میں رہے اور ماں کے قبضے میں تیس ہزار اشرفیاں ہوں پھر اُس بچے کو ایسی بیش بہا تعلیم دی جائے کہ اُس کے شاگرد دنیا کے تام اور امام ہوں۔ بے شک یہ اُس عہد کی عورتوں کے عقیل اور علم دوست ہونے کی دلیل ہے ہمارے ملک میں اگر چودھویں صدی کی کسی ماں کے اختیار میں تیس ہزار اشرفیاں اور ایک بچہ دے دیا جائے تو معلوم نہیں بلند اقبال صاحبزادے کے اخلاق کہاں تک ترقی کریں[۵]۔ عربی کی ریاضیات میں شرح چغمنی جس پائے کی کتاب ہے اُس سے ہر ایک مشرقی طالب علم

[۵] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۸۳

واقف ہیں لیکن یہ بات بہت کم معلوم ہوگی کہ اگر قاضی زادۂ روم کی خواہر اپنے بھائی کی مدد نہ کرتیں تو ہمارے کتاب خانے اس مشہور کتاب سے محروم رہتے۔ شارح چغمنی نے ابتدائی علوم کی تحصیل اپنے وطن روم میں کی تھی۔ جب اساتذۂ عجم کے کمال کا شہرہ اُنہوں نے سُنا تو خراسان کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ اور چھپکے چھپکے سامان سفر کرنے لگے۔ بہن زیرکی سے بھائی کے ارادے کو پاگئیں اور بجائے اس کے کہ رو پیٹ کر گھر بھر کو خبردار کر دیتیں اپنا بہت سا زیور بھائی کے سامانِ سفر میں چھپا چھپا کر رکھ دیا تاکہ مسافرت میں خرچ کی طرف سے پریشانی نہو۔ بہن کے اِس عزیز توشے نے جو نفع دیا ہوگا اُس کا اندازہ علامہ بھائی کے دل سے کوئی پوچھتا[۵۱]۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ امام بخاری نے جب چودہ برس کے سِن میں علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا شروع کیا تھا تو اُن کی والدہ اور خواہر نگرانی کی متکفل تھیں۔

اُمرا میں علم کا ذوق

ہم اس عنوان میں صرف دو تین مثالیں بیان کرینگے مثالوں کی قلت کسی ذہن میں واقعات کی قلت کا شبہ نہ پیدا کرے۔ ابتدائی ہجری صدیوں میں مسلمان اُمرا عالم ہونے کی حیثیت سے علماء کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔ بنی موسیٰ اور سیف الدولہ کے فضل وکمال سے کون واقف نہیں۔ مگر چونکہ ہم دوسری وادی میں ہیں اس لئے انھیں مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اُستاد ابن عمید وزیر آل بُویہ نے ایک دفعہ بیان کیا کہ میں اس خیال باطل میں تھا کہ وزارت وریاست سے زیادہ پرلطف کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ مگر جب میں نے سلیمان ابن ایوب طبرانی اور جعابی کا مناظرہ سُنا تو اُس لطف کو بھول گیا۔ اس مناظرہ میں طبرانی قوت حافظہ کے زور سے

---

[۵۱] شق۔ ج ۱ صفحہ ۱۷

اور جعانی جودت ذہن کی مدد سے اپنے اپنے حریف پر غالب آنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی آوازوں میں بلندی پیدا ہونے لگی۔ ایک بار جوش میں جعانی نے کہا کہ میرے پاس ایک ایسی حدیث ہے جو سارے عالم میں کسی کے پاس نہیں۔ طبرانی نے کہا "بسم اللہ سُنائیے"۔ جعانی نے سلسلۂ روایت شروع کیا۔ ابو خلیفہ نا سلیمان ابن ایوب۔ طبرانی "سلیمان ابن ایوب میرا ہی نام ہے۔ اور ابو خلیفہ نے یہ حدیث مجھ ہی سے حاصل کی تھی اب تم مجھ سے اس کی سند عالی حاصل کر لو"۔ جعانی یہ سُن کر دم بخود رہ گئے۔ مجھ کو طبرانی کے اُس وقت کی فرحت دیکھ کر یہ تمنا ہوئی کہ کاش میں طبرانی ہوتا تاکہ یہ لطف مجھ کو نصیب ہوتا۔[1] ادیب بے مثل صاحب ابن عبّاد فخر الدولہ کے وزیر تھے ایک موقع پر امیر بخارا نوح سامانی نے اپنی وزارت کے لئے در پردہ اُنھیں طلب کیا۔ ابن عباد نے خفیہ نہ آسکنے کے جو عذر لکھے اُن میں یہ بھی تھا کہ صرف میری کتابوں کے اُٹھانے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وزیر ممدوح کے ہمراہ ہر سفر میں صرف ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ رہتے تھے۔[2] علامہ موفق الدین بغدادی ایک بار قاضی فاضل سے (جو سلطان صلاح الدین کے سب سے زیادہ مقرب امیر تھے) ملنے گئے تو اُن کو اس حال میں پایا کہ خود لکھ رہے تھے اور دو کاتبوں کو مضمون بتلاتے جاتے تھے۔ ان کے پہنچنے پر بہت سے علمی نازک سوال اُن سے کیے مگر لکھنا اور مضمون بتلانا برابر جاری رہا۔ علامۂ ممدوح بیان کرتے ہیں کہ وہ شخص سراپا قلب و دماغ معلوم ہوتا تھا۔ دوران تحریر میں لب اور چہرے سے جو طرح طرح کی حرکات ہویدا ہوتی تھیں وہ صاف کہہ رہی تھیں کہ کس قدر ولولہ اس کی طبیعت میں مضمون آفرینی کا تھا۔

---

[1] تذ - ج ۳ - صفحہ ۱۲۹ [2] ابن - ج ۱ - صفحہ ۳۳۲ و ۳۳۴ [3] عیون - ج ۲ - صفحہ ۲۰۵

عنوانِ دُوم

حق پسندی و راست گوئی

جس پاک گروہ کو ہم نے مدارس میں سرگرمِ طلبِ علم چھوڑا تھا اب اُس کی نسبت یہ دیکھنا ہی کہ مکتب اور مدرسے سے باہر آکر اُس کے اخلاق اور اُس کی طرزِ معاشرت کیسی ہی۔ اُس سے علاوہ اس کے کہ علما کے مزید حالات معلوم ہوں ہماری گزشتہ تعلیم کی نسبت یہ رائے قایم ہوسکے گی کہ وہ کس ڈھنگ کے انسان پیدا کرتی تھی۔ عنوان اندا میں ہم اخلاقِ انسانی کی سب سے اعلیٰ اور افضل صفت کو اپنا موضوع قرار دیتے ہیں۔ وہ کیا ہے حق پسندی اور راست گوئی دنیا میں شاید کوئی انسان ہوگا جو اس امر کا مدعی نہو کہ وہ حق اور راست بازی پر دل و جان سے شیدا ہی لیکن عمل (جو قول کی کسوٹی ہی) صاف کھرے اور کھوٹے کی حقیقت کھول دیتا ہی۔ اور حق یہ ہی کہ حق پسندی جتنی بے بہا صفت ہی اُسی قدر دشوار اور معرکہ خیز ہی۔ وہ شخص بے شک حق پرست ہوسکتا ہی جو زبردست کے خوف، منفعت کی اُمید اور عزیزوں کی محبت کو حق پر سے نثار کر دے یا بالفاظِ دیگر سوائے حق کے اُس کو کسی سے کچھ سروکار نہو۔ کیا فرمایا تھا حضرت خیر البشر نے اپنے صحابی جناب عمرؓ کی نسبت فَتَرَکَہُ الحقُّ وَمَالَہُ مِن صَدِیق یعنی حق گوئی نے عمرؓ کو بے یار کر کے چھوڑا۔ اگر ایسے انسان دُنیا میں بہت کم ہوئے ہیں۔ خداوند تعالیٰ جن دلوں کو اس قدر بے لوث فرما دیتا ہی کہ وہ بجز حق کے سب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں وہ البتہ اس عالی رتبے کو حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک سچ

کی خاطر زبردست سے بے خوف، فائدے سے بے پروا اور عزیزوں سے ناآشنا رہنا بیحد مشکل ہی اور غالباً کسی آدمی کی حق پرستی کے امتحان کے لئے ان حالتوں سے زیادہ عمدہ معیار ہات آنا ناممکن ہی۔ لہذا ہم علمائے سلف کی حق پسندی انھیں تینوں حق کے دشمنوں کے مقابلے میں ثابت کریں گے ورنہ وعظ اور تصنیف یہ دونوں توبڑے دل کشا میدان اظہار حق کے ہیں۔

حق پسندی بمقابلۂ حکام

لفظ حکّام میں جس قدر جبروت اور قہّاری اگلی تاریخ میں نظر آتی ہی اُس کی نظیر آج کل کے آئینی عہد میں ملنی ناممکن ہی۔ جس سلطنت کے زیرسایہ ہم رہتے ہیں وہ تو ایسی امن دوست اور رفاہ پسند ہی کہ ان مہیب صفات کا کوئی شمہ ان ممالک میں نہیں پایا جاتا اَلحمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ ذٰلِکَ مگر سارے عالم کے مخبر اخبار بھی ہم کو زمانۂ حال میں کوئی ایسا فرماں روا نہیں تبلاتے جس کے دربار میں حجاج ابن یوسف یا تیمور کی ہیبت کا نشان مل سکے۔ پس جب ہم اس دور عافیت میں حق پسندی کا قحط پاتے ہیں تو اگلے زمانہ میں اس صفت کا وجود عنقا ہونا چاہیئے تھا لیکن واقعات اس کے خلاف ثابت کرنے کو آمادہ ہیں۔ ان واقعات کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہی کہ جن بزرگوں نے اگلے جلاد بادشاہوں کے عہد میں حق بنایا اُنھوں نے بڑا کام کیا۔

ایک مرتبہ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) نے حجاج کو خطبہ پڑھتے دیکھا تو غضب آلود ہو کر برملا فرمانے لگے۔ خدا کا دشمن! خدا کی حرام کی ہوئی باتوں کو اس نے حلال کرلیا۔ خدا کے گھر کو خراب کیا اور خدا کے دوستوں کو قتل۔ حجاج نے اپنی نسبت یہ سخت کلمات سُن کر پوچھا کہ یہ کون ہی کسی نے کہا عبداللہ ابن عمر۔ اتنا سن کر وہ سفاک آپ کی طرف مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ بڑے میاں اب تم سٹھیا گئے ہو اور تمھارے حواس بجا نہیں رہے۔ منبر سے اُترا تو دل میں بخار بھرا ہوا تھا اپنے ایک ملازم کو ایما کیا اور اُس نے ایک زہر میں بُجھا ہوا حربہ

حضرت ابن عمر کے پاؤں پر مار دیا اسی ہتھیار کی سمیّت آپ کی وفات کا باعث ہوئی۔ مزید عنایت دیکھئے کہ جو مرض خود پیدا کیا تھا اُس کی عیادت کو آیا۔ مگر حضرت عبداللہ نے نہ اُس کے سلام کا جواب دیا نہ کلام کیا۔[۱] جو واقعہ ہم آگے بیان کرتے ہیں وہ استقلال و ثابت قدمی کی ایک بے نظیر مثال پیش کرتا ہے اور اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق پرستی اُن بزرگوں کے دل ایسے مضبوط کر دیتی تھی کہ موت اُن کے سامنے کھڑی ہوتی اور وہ بے پروائی سے ہنستے۔ اور جلّاد کے ہات میں شمشیر برہنہ اُن کے واسطے کوئی خوفناک چیز ثابت نہوتی ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ جلیل القدر تابعی حضرت سعید ابن جُبیر سے دولت بنی اُمیہ مخالف ہوگئی تھی اور یہ بچتے پھرتے تھے۔ مگر ایسی زبردست سلطنت کے پنجے سے بچنا ناممکن تھا۔ والیٔ مکہ نے ایک موقع پر ان کو پکڑ کر حجاج کے پاس بھیجدیا۔ اُس کی جفا جو طبیعت کو گویا ایک ضیافت ہات آئی۔ اوّل تو نام پوچھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ سعید ابن جُبیر۔ حجاج اس قدر طیش میں تھا کہ اُس کو اُن کے نام کے اچھے الفاظ بھی تلخ معلوم ہوئے۔ اور جوشِ غضب میں کہا کہ انت شقّی بن کسیر سعید۔ میری والدہ میرا نام تجھ سے بہتر جانتی تھیں حجاج اور بگڑا اور کہا کہ شقیتَ امک و شقیتَ انت یعنی تمہاری والدہ بھی بدبخت اور تم بھی بدبخت سعید۔ غیب کا جاننے والا تیرے سوا اور ہے۔ حجاج (جلکر) دیکھو تو میں تم کو دنیا کے بدلے میں کیسی لپٹیں مارتی ہوئی آگ دیتا ہوں۔ سعید۔ اگر میں یہ جانتا کہ یہ تیرے اختیار میں ہے تو میں تجکو اپنا معبود بنا لیتا۔ اب حجاج نے (جو اُن کے قتل کے لیے بہانہ ڈھونڈ ہتا تھا) اُن سے مذہبی سوال شروع کئے جو پولیٹیکل پہلو لئے ہوئے تھے۔ اور پوچھا کہ آں حضرتؐ کی نسبت تمہارا کیا قول ہے۔ سعید۔ آپ نبی رحمت اور امام ہدیٰ تھے۔ خلفا کے بارے میں تمہاری کیا

---

[۱] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۳۲

رائے ہی سعید لست علیھم بوکیل (میں ان کا قاضی نہیں) حجاج۔ اُن میں کون سب سے بہتر تھا۔
سعید ارضاھم لخالقی جو میرے مالک کی مرضی کا سب سے زیادہ پابند تھا۔ حجاج کون
سب سے زیادہ رضا جو تھا۔ سعید۔ علم ذٰلِکَ عند الذی یعلم سرّھُمْ ونجواھُم
(اُس کو وہ خوب جانتا ہے جو اُن کے بھیدوں سے اور پوشیدہ باتوں سے واقف ہے) غرض
عرصے تک اس قسم کے سوال و جواب ہوتے رہے مگر حضرت ابن جُبیر نے کوئی موقع گرفت کا نہیں
پیدا ہونے دیا۔ اور اپنے صاف صاف مگر چیچے تُلے جوابوں سے حجاج کی برہمی برابر بڑھاتے گئے۔
آخر اُس نے کھسیا کر کہا اختر یا سعید ای قتلۃ اقتلک (اے سعید بتاؤ میں کس شکل سے تم کو
قتل کروں) سعید۔ اختر یا حجاج لنفسک فواللہ لا تقتلنی قتلۃ الا قتلک اللہ مثلھا
(اے حجاج تو خود ہی پسند کر قسم رب کی جس طرح تو مجھ کو قتل کرے گا اُسی طرح خدا تجھ کو قتل
کریگا) حجاج کیا میں معاف کردوں۔ سعید۔ اگر عفو ہو تو خدا کی طرف سے ہو۔ رہا تو پس تو نہ کسی
کو بری کر سکتا ہے نہ کسی کا عذر قبول۔ اتنی بحث کے بعد حجاج نے آخری حکم دیدیا اور جلاد حضرت
جُبیر کو باہر لائے۔ حجاج تو اپنی انتہائی طاقت صرف کر چکا تھا۔ لیکن خدا کے سعید بندے کو
ابھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ باہر آکر ہنسے۔ حجاج کو خبر ہوئی تو اُس نے پھر بلایا اور ہنسی کی وجہ
دریافت کی۔ ابن جبیر نے فرمایا۔ عجبت من جرأتک علی اللہ وحلم اللہ علیک
(مجھ کو خدا کے مقابلے میں تیری جرأت پر اور تیری نسبت خدا کے حلم پر تعجب ہوا) حجاج
اس گرم فقرے کو سُن کر اور بھڑکا اور جلادوں سے کہا میرے سامنے گردن مارو۔ اب ابن
جُبیر شہادت کے لیے مستعد ہوگئے اور قبلہ رو ہو کر فرمایا۔ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ حَنِيفًا وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ[1] حجاج۔ ان کا مونھ قبلے سے پھیر دو۔ سعید

---

[1] میں نے اپنا مونھ کیا اُسی کی طرف جس نے بنائے آسمان و زمین یک طرف کا ہو کر اور میں نہیں شریک
کرنے والا

اینما تولوا فثم وجہ اللہ (جدھر تم پھرو گے اُسی طرف خدا کا مونھ ہی) حجاج! ذبحھا ڈال دو۔ سعید۔ منہا خلقناکم و فیہا نعیدکم و منہا نخرجکم تارۃ اخریٰ (ہم نے اُسی سے (یعنی زمین سے) تم کو پیدا کیا اور اُسی میں تم کو لوٹا ئینگے اور اُسی سے ایک دفعہ تم کو پھر نکالینگے) حجاج نے اُن کی سیف زبانی سے تنگ آکر جلادوں کو اشارہ کیا کہ جلد اپنا کام کرو۔ سعید بولے، میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہی اور کوئی اُس کا شریک نہیں۔ اور اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں میری جان تو لے جب تو میدان حشر میں مجھ کو ملے گا تو میں تجھ سے لے لونگا۔ حضرت ابن جبیر کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ جلاد کا ہات اُٹھا اور اُن کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون[۹]

بنا کردند خوش رسمی بخون و خاک غلطیدن خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

بعد قتل اُن کے جسم سے خلاف معمول خون بہت نکلا جس سے حجاج سے سفاک کو بھی حیرت ہوئی اور اُس نے اپنے طبیب خاص تیاذوق سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تیاذوق نے کہا کہ چونکہ ان کی خاطر بالکل مطمئن تھی اور قتل کا خوف قطعاً اُن کے دل میں نہ تھا اس لئے خون اپنی اصلی مقدار پر قائم رہا۔ بخلاف اور مقتولوں کے کہ اُن کا خون ہیبت کے مارے پہلے ہی خشک ہو جاتا ہی۔ علاوہ اس طبی شہادت کے حضرت ابن جبیر کے کلام کی برجستگی صاف کہہ رہی ہی کہ اُن کی طبیعت بالکل آسودہ اور آرمیدہ تھی اور اضطراب کا نام بھی اُن کے قلب میں نہ تھا۔ یہ شعبان ۹۵ھ کا واقعہ ہی۔ رمضان سنہ مذکور میں حجاج بھی راہی عدم ہو گیا[۹]

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند[۱]

انھیں کے ہم نام اور ہم عصر دوسرے تابعی حضرت سعید ابن المسیب کا ذکر ابن السائب کرتے

---

[۹] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۵ و عیون۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۳

ہیں کہ ایک روز وہ اور میں دونوں بازار میں بیٹھے تھے کہ خلیفۂ دمشق کا برید (نامہ بر) وہاں سے گزرا ابن المسیب نے اُس سے پوچھا کہ تم بنی مروان کے برید ہو۔ برید۔ جی ہاں۔ ابن المسیب۔ تم نے اُن کو کس حال میں چھوڑا۔ برید۔ بخیر۔ ابن المسیب۔ نہیں بلکہ تم نے اُن کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ آدمیوں کو بھوکا مارتے ہیں اور کتوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ برید یہ سُن کر بگڑ گیا اور آنکھیں نکال کر اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ ابن السائب کہتے ہیں کہ میں دہشت زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھئے اب کیا ہو۔ برید دیر تک تیور بدلے کھڑا رہا مگر پھر کچھ سوچ کر چلدیا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے کہا ابن المسیب خدا تم کو نیکی دے تم کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو۔ انھوں نے فرمایا بیہودہ چپ رہ جب تک میں حق پر قائم ہوں واللہ خدا مجھ کو دشمنوں کے قبضے میں نہ دیگا۔ ایک دفعہ تیس ہزار درہم دولت مذکور کی طرف سے اُن کی خدمت میں پیش کئے گئے تو اُنھوں نے فرمایا کہ نہ مجھ کو بنی امیہ کی پرواہ ہے نہ اُن کے مال و دولت کی۔ میں خدا کے سامنے جاؤنگا اور وہ میرا اور ان کا انصاف کریگا۔ انھیں حق گوئیوں کا یہ نتیجہ یہ ہوا کہ خلیفہ عبدالملک نے جاڑے کے موسم میں اُن کو پٹوا کر سرد پانی ڈلوایا اور ایک دوسرے موقع پر پچاس درّے لگوا کر سر بازار تشہیر کرائی۔[۵۱] عمر بن ہبیرہ جب خلیفۂ دمشق یزید ابن عبدالملک کی جانب سے والی عراق و خراسان مقرر ہو کر آیا تو اُس نے خواجہ حسن بصری، امام ابن سیرین اور امام شعبی کو طلب کیا اور اُن کے سامنے یہ مدبرانہ تقریر کی۔ یزید ابن عبدالملک کو خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں پر خلیفہ مقرر کیا ہے اور اُن سے اُس کی اطاعت کا عہد لیا ہے اور ہم سے (یعنی ملازموں سے) اُس کے حکم سننے اور بجالانے کا۔ مجھ کو جو عہدہ خلافت کی طرف سے عطا ہوا ہے وہ آپ سب کو معلوم ہے۔ خلیفہ کی جانب سے ایک حکم مجھ کو ملتا ہے اور میں اُس کی بے تامل تعمیل کرتا ہوں۔

---

[۵۱] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۰۷

اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ خواجہ حسن بصری نے اس پولٹیکل گفتگو کا جواب جن صاف اور سچے الفاظ میں دیا وہ قابل شنید ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اے ابن ہبیرہ! یزید کے معاملے میں خدا تعالےٰ سے ڈر اور خدا تعالیٰ کے معاملے میں یزید کا خوف مت کر خدا تعالیٰ تجھ سے یزید کے شر کو دفع کرسکتا ہے۔ مگر یزید اس احکم الحاکمین کے قہر کو نہیں روک سکتا۔ وہ وقت بہت دُور نہیں ہے کہ خدا وند عالم تیرے پاس اپنا ایک فرشتہ بھیجے گا جو تجھ کو شاندار تخت اور وسیع محل سے علٰحدہ کرکے تنگ قبر میں پہنچادے گا۔ وہاں سوائے تیرے اعمال کے کوئی تجکو نجات نہیں دلوانے کا۔ اے ابن ہبیرہ! اگر تو خدا کا گناہ کرے تو خوب سمجھ لے کہ خلیفہ کو اُس نے اپنے دین کا اور اپنے بندوں کا محافظ اور ناصر مقرر کیا ہے۔ پس خدا کے دین کے خلاف اُس کے مقرر کئے ہوئے حاکم کی وجہ سے جسارت مت کر۔ کیونکہ خالق اکبر کے مقابلے میں مخلوق کا حکم ماننا کسی طرح روا نہیں[۹۱]۔ اسی یزید ابن ہبیرہ نے امام اعظم کو ایک دفعہ طلب کرکے عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ امام صاحب چونکہ یہ بار اپنے ذمے لینا نہیں چاہتے تھے لہذا انکار کردیا۔ ابن ہبیرہ اس انکار سے بگڑ گیا اور گیارہ روز تک دس دس دُرّے روزانہ اُن کے لگوائے۔ تاہم اُس کا اصرار اُن کے انکار پر غالب نہ آسکا۔ اسی عہدۂ قضا کی بدولت امام ابوحنیفہ کے مقدر میں اور سختی لکھی تھی۔ جب منصور بغداد کا خلیفہ ہوا تو اُس کی نظر بھی اُس منصب کے لیئے امام ممدوح پر ٹھہری چنانچہ اُن کو کوفے سے طلب کیا اور عہدۂ مذکور کے قبول کرنے کی فرمائش کی۔ امام صاحب اب بھی اپنی رائے پر سختی سے قائم تھے لہذا انکار کیا۔ منصور نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم کو قاضی مقرر کرونگا۔ اُنھوں نے جواباً بالقسم فرمایا کہ میں اس عہدے کو منظور نہیں کرونگا۔ خلیفہ نے دوبارہ قسم کھائی۔ اُنھوں نے مکرر قسمیہ انکار کیا

---

[۹۱] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۸

اور اپنے انکار کی وجہ یہ بیان کی ہیں اپنے آپ کو اس منصب کے قابل نہیں سمجھتا۔ حاجب ابن ربیعہ نے (جو دربار میں حاضر تھا) خلیفہ کی خوشامد کی راہ سے کہا کہ امیر المومنین قسم کھا چکے ہیں پھر بھی تم انکار کیئے جاتے ہو۔ امام فقہ نے فرمایا کہ امیر المومنین کے لیے کفارۂ قسم ادا کر دینا بہ نسبت میرے زیادہ آسان ہی۔ خلیفہ جب اُن کی رائے کو کسی طرح مقید نہ کر سکا تو خود اُن کو قید خانے بھیجدیا اور بحالت محبوسی سنہ ۱۵۰ھ میں امام اعظم نے وفات پائی۔ ان دونوں واقعوں کے ساتھ ایک تیسرا واقعہ اور ملایئے جس سے امتیاز مراتب کا نکتہ حل ہوگا۔ ایک زمانے میں حاکم کوفے نے یہ حکم دیدیا تھا کہ ابو حنیفہ فتویٰ نہ دیا کریں۔ چنانچہ امام صاحب نے فتویٰ دینا چھوڑ دیا تھا۔ اُنھیں روزوں کا ذکر ہی کہ ایک دن امام ممدوح گھر میں تشریف رکھتے تھے بی بی اور بچے پاس تھے صاحبزادی نے روزے کے متعلق ایک مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا بیٹا! یہ مسئلہ اپنے بھائی حماد سے پوچھ لو مجھ کو حاکم کی طرف سے فتویٰ دینے کی ممانعت ہی، اس لیے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا[۵۱]۔ کیا اس سے بڑھکر حق پرستی ہو سکتی ہی۔ عہدۂ قضا قبول نہ کرنا اپنے نفس کا حق تھا جس کو اُنھوں نے حاکم اور خلیفہ کے مقابلے میں برسر دربار نہیں چھوڑا۔ اور فتویٰ نہ دینا حاکم کا حق تھا جس کو اُنھوں نے خلوت اور گھر کی چار دیواری کے اندر بھی ملحوظ رکھا۔ امام یزید ابن حبیب تابعی ایک دفعہ علیل تھے۔ ابن سہیل والی مصر اُن کی عیادت کو آیا۔ اثنائے کلام میں اُس نے پوچھا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس سے نماز جائز ہی یا نہیں۔ امام نے یہ سُن کر غصے سے مونھ پھیر لیا اور کچھ نہیں کہا۔ جب امیر نے چلنے کا قصد کیا تو اُس کو نظر بھر کر دیکھا اور کہا تو روزانہ خدا کے بندوں کا خون بہاتا ہی اور مچھر کے خون کا فتویٰ پوچھنے چلا ہی[۵۲]۔ خلیفہ دمشق ہشام ابن عبد الملک

---

[۵۱] ابن-ج ا-صفحہ ۲۵۳ و ج ۲-صفحہ ۱۶۳ و ۱۶۴ و ۱۶۶ [۵۲] تذ ج ا-صفحہ ۱۱۶

نے اپنا ایک معتمد امام اعمش کوفی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اُن سے حضرت عثمان کی خوبیاں اور حضرت علی کی بُرائیاں لکھوا لائے۔ جب ایلچی نے خلیفہ کا شقہ دیا تو اُنھوں نے اُس کو پڑھ کر ایک بکری کے مونھ میں دے دیا بکری اُس کو چبا چکی تو معتمد خلافت سے فرمایا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اُس کے پروانے کا یہی جواب ہے۔ قاصد کو حکم تھا کہ جواب تحریری لائے۔ لہٰذا اُس نے منت کی کہ جو کچھ جواب ہو لکھ دیجئے اصرار سے تنگ ہو کر اُنھوں نے یہ جواب لکھ دیا۔ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ۔ امّا بعد فیا امیر المومنین لو کان لعثمان رضی اللہ عنہ مناقب اھل الارض ما نفعتك ولو کانت لعلی رضی اللہ عنہ مساوی اھل الارض ما ضرتك فعلیك بخویصة نفسك والسلام یعنی اے امیر المومنین اگر حضرت عثمان میں سارے جہان کی خوبیاں تھیں تو تجھ کو کچھ نفع نہیں اور اگر حضرت علی میں دنیا بھر کی برائیاں تھیں تو تیرا کچھ نقصان نہیں پس تو خاص کر اپنے نفس کی خبر لے۔ والسلام۔

ابو جعفر منصور خلیفہ بغداد نے ایک بار امام عبداللہ ابن طاؤس کو اپنے پاس بلایا اور اثنائے ملاقات میں ابن طاؤس سے کہا کہ اپنے والد سے کوئی حدیث روایت کرو۔ اس فرمائش سے ابن طاؤس کے ہاتھ اس امر کا گویا موقع لگا کہ وہ خلیفہ کو اُس کی بد عہدیوں اور سختی پر تنبیہ کریں اور اُنھوں نے یہ حدیث انتخاب کر کے سُنائی حدثنا ان اشد الناس عذابا یوم القیامة رجلٌ اشرکہ اللہ تعالیٰ فی سلطانہ فادخل علیہ الجور یعنی میرے والد نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے بڑھ کر عذاب اُس کو ہوگا جس کو خدا تعالیٰ اپنی حکومت میں شرکت دے اور پھر وہ ظالمانہ حکومت کرے منصور سے قہار فرمان روا کے سامنے اور یہ جرأت۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مجھ کو ابن طاؤس کے

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۱۳

قتل کا پورا یقین ہوگیا اور میں نے اپنے دامن سمیٹ لئے کہ مبادا اُن کے خون کی چھینٹیں میرے کپڑوں پر پڑیں۔ خلیفہ دیر تک ساکت رہا پھر نگاہ اُٹھائی اور ایک سوال کیا۔ ابن طاؤس کے قلب پر اب بھی خلیفہ کا رعب غالب نہیں آیا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی پوری آزادی سے دیا۔ خلیفہ نے تنگ آکر کہا قوما عنی یعنی میرے پاس سے دونوں اُٹھ جاؤ۔ ابن طاؤس نے فرمایا ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ یہ تو ہماری عین مراد ہے۔ اور یہ کہکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اُس روز سے میں ابن طاؤس کے فضل کو مان گیا ہوں[۱]۔ فقہ کے چار امام جن کی امامت آج تک چار دانگ عالم میں مُسلم ہے اور کروروں نفوس انسانی پر اُن کی روحانی سلطنت صدہا برس سے قایم ہے اُن میں سے امام ابوحنیفہ کا حال آپ سُن چکے امام مالک کے ستر دُرّے اس وجہ سے مارے گئے کہ کسی مسائلے میں حق کا اور حکومت کا مقابلہ تھا اور اُنھوں نے فتویٰ دینے میں حق کی رعایت کی تھی[۲]۔

یہی سلوک امام احمد ابن حنبل کے ساتھ خلیفہ مامون الرشید کی خلافت میں عقائد کے ایک مسائلے کے اختلاف کی وجہ سے کیا گیا[۳]۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ خلیفہ منصور کے چہرے پر مکھی بیٹھی اُس نے اُڑا دی۔ مکھی حسب عادت پھر آن بیٹھی خلیفہ نے پھر اُڑا دی۔ غرض کئی دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ آخر خلیفہ نے جھلا کر ابن سلیمان مشہور مفسر سے پوچھا کہ مکھی پیدا کرنے کی خدا کو کیا ضرورت پڑی تھی۔ اُس عالم ربانی نے فرمایا کہ متکبّروں کا غرور توڑنے کے لئے پیدا کی[۴]۔ خلافتِ عباسیہ نئی نئی قائم ہوئی تھی اور خاندان بنی اُمیہ کے نیست و نابود کرنے اور ملک سے اُن کا اثر مٹانے کی کوششیں بڑی بے دردی اور سفّاکی سے عمل میں آرہی تھیں کہ اسی اثنا میں عبداللہ ابن علی خلیفہ سفّاح کا چچا شام کا حاکم مقرر ہوا۔ امیر مذکور نے

---

[۱] ابن ج ۱ صفحہ ۲۲۲ [۲] ابن ج ۱ صفحہ ۳۹۴ [۳] ابن ج ۲ صفحہ ۱۶۴ [۴] ابن ج ۲ صفحہ ۱۱۲

وہاں پہنچکر اوّل تو خلافت کے بقیّہ دعوے داروں کی پوری صفائی کی اُس کے بعد ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا جس میں جاہ و جلال کا اظہار انتہا کو پہنچایا گیا تھا چار جنگی صفیں ایوانِ دربار میں قایم تھیں جو مختلف مہیب ہتھیاروں سے مسلح تھیں۔ ان صفوں کے بیچ میں تختِ امارت نصب تھا۔ جب امیر نے دربار میں آکر جلوس کیا تو شام کے مقتدا امام اوزاعی طلب ہوئے۔ امام ممدوح جس وقت دار الامارۃ کے دراوزے پر پہنچے تو گھوڑے پر سے اُتار لیے گئے اور دو آدمیوں نے اُن کے بازو پکڑ کر تخت سے اتنا قریب لا کر کھڑا کیا کہ امیر خود اُن سے کلام کر سکے۔ امیر نے اُن کو دیکھ کر کہا کہ تمھارا نام عبد الرحمٰن ہی۔ امام اوزاعی جی ہاں۔ خدا امیر کو صلاحیت دے۔ امیر۔ بنی اُمیّہ کی خونریزی کی نسبت تمھاری کیا رائے ہی۔ امام۔ تمھارے اور اُن کے مابین چونکہ عہد تھا اس لیے تم کو لازم تھا کہ عہد و پیمان کی رعایت کرتے اور عہد شکنی نہ کرتے۔ امیر۔ (بگڑ کر) یہ ہم جانیں اور وہ جانیں۔ ہم میں باہم کوئی عہد نہ تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کے تیور پھرے دیکھ کر میرے قلب پر بے کسی کی سی حالت طاری ہوئی اور جان کا خوف معلوم ہونے لگا۔ اُسی وقت مجھ کو خیال آیا کہ عبد الرحمٰن! ایک دن اس سے بھی بڑے حاکم کے حضور میں حاضر ہونا ہی اس خیال کے آتے ہی میرے دل کا اضطراب جاتا رہا اور قوت سی پیدا ہو گئی اور میں نے صاف صاف امیر سے کہا کہ بے شک اُن کا خون تم پر حرام تھا۔ اس زور دار فقرے کو سُن کر امیر طیش کے مارے تھرا گیا جوشِ خون سے آنکھیں سُرخ ہو گئیں اور رگیں اُبھر آئیں ایسی غضب کی حالت میں کہنے لگا کہ ویحک[۵] اللہ یہ تم نے کس طرح کہا۔ امام! اس طرح کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہی کہ کسی مردِ مسلمان کا قتل روا نہیں جب تک کہ ان تین حالتوں

---

۵ خدا تم پر رحم کرے

میں سے ایک حالت پیش نہ آئے یاتو اس حال میں زنا کرے کہ اُس کی شادی ہوچکی ہو۔ یا قاتل ہو یا مرتد ہو جائے۔ امیر۔ کیوں! کیا ہماری حکومت دینی نہیں (گویا اُس کا یہ مطلب تھا کہ چونکہ ہماری خلافت از روئے دین ثابت ہے لہذا اُس کا مخالف تارک دین ہوا) امام تمہاری حکومت دینی کیوں کر ہوسکتی ہے۔ امیر کیا آن حضرت ؐ نے حضرت علی رضؓ کے لیے وصیت نہیں فرمائی۔ امام۔ اگر حضرت علی رضؓ کے لیے وصیت ثابت ہوتی تو دونوں حَکَم حکم نہ دیتے۔ امیر کے پاس چونکہ اس کا جواب کچھ نہ تھا اس لیے خاموش تو ہوگیا مگر شدت اشتعال کے سبب سے سراپا غضب معلوم ہوتا تھا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ امیر کی خاموشی نے مجھ کو یقین دلایا کہ کوئی دم میں میرا سر قدموں پر آتا ہے تھوڑے عرصے کے بعد خلاف توقع امیر نے ہات کے اشارے سے حکم دیا کہ امام دربار سے باہر کر دیئے جائیں چنانچہ یہ وہاں سے تشریف لے آئے۔ دارالامارۃ سے کچھ دُور نکلے تھے کہ ایک سوار ان کی طرف تیز آتا ہوا نظر پڑا۔ سوار کو دیکھ کر جان کا خوف امام اوزاعی کو اوّل سے بھی زیادہ ہوا۔ اور وقت اخیر سمجھ کر نماز شروع کر دی۔ جب سلام پھیرا تو سوار نے سلام کیا اور اشرفیوں کی ایک تھیلی من جانب امیر پیش کی اُنھوں نے وہ اشرفیاں قبول کرلیں اور گھر پہنچنے سے پہلے مستحقوں کو تقسیم کر دیں[۵۱]۔ اسلام نے بیت المال کی بنیاد جن اصول پر ڈالی تھی وہ خلافت راشدہ کے بعد بالکل بدل گئے تھے۔ اور مسلمانوں کا قومی مال محض خلفاء و سلاطین کا جیب خرچ خیال کیا جاتا تھا۔ جو علمائے اسلام بیت المال کے اصلی اغراض سے واقف تھے اُن کے دل اس اسراف کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے۔ اور جب اُن کو موقع ہاتھ آتا اُن کی زبان خلفا کو برملا متنبہ کرنے سے باز نہیں رہتی تھی حضرت سُفیان ثوری ایک دفعہ

---

[۵۱] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۶۲

خلیفہ مہدی کے پاس گئے اور اُس سے کہا کہ مجھ کو یہ روایت پہنچی ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سفرِ حج میں صرف بارہ اشرفیاں صرف کی تھیں۔ تمہارا اسراف جس حد کو پہونچا ہے وہ ظاہر ہے۔ خلیفہ نے خشم ناک ہو کر کہا کہ اپنی ہی ذلیل حالت میری بھی کیا چاہتے ہو حضرت سفیان نے جواب دیا کہ مجھ سے مت بنو مگر جس حال میں ہو اُس میں تو کمی کر دو۔[۵۱]

ایک دفعہ ہارون الرشید اور شاہزادے امام مالک کے یہاں گئے۔ خلیفہ نے امام صاحب سے حدیث سنانے کی فرمائش کی۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ میں نے عرصے سے طریقۂ قرأت چھوڑ دیا ہے اب اور لوگ حدیث مجھ کو سناتے ہیں اور میں سنتا ہوں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ بہتر ہے میں ہی سناؤں گا۔ مگر اول عام آدمیوں کو اپنی مجلس سے باہر کر دیجئے۔ امام مالک نے جواب میں ارشاد کیا کہ اگر خواص کی خاطر سے عوام محروم کئے جائیں گے تو خواص کو بھی نفع نہیں پہنچ سکتا۔ یہ فرما کر اپنے ایک شاگرد ابن عیسیٰ کو حکم دیا کہ سبق شروع کریں۔ چنانچہ ابن عیسیٰ نے فوراً سبق شروع کر دیا اور خلیفہ کو خاموش رہنا پڑا۔[۵۲]

خلیفۂ مذکور نے ایک بار ابن ادریس کو بلا کر عہدۂ قضا قبول کرنے کے واسطے کہا۔ اُنھوں نے انکار کیا تو رشید نے بگڑ کر فرمایا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا۔ ابن ادریس نے متانت سے جواب دیا کہ کاش میں تیری صورت نہ دیکھتا، اور یہ کہہ کر دربار سے چلے آئے۔[۵۳] امیر سلیمان ابن علی نے اہواز سے ایک قاصد امام ادب خلیل بصری کے پاس بھیجا اور اُن کو امیر زادے کی تعلیم کے لئے طلب کیا۔ ایلچی کی خبر پا کر وہ ادیب بے مثل باہر آیا۔ خشک روٹی کا ایک ٹکڑا ہات میں تھا وہ ٹکڑا قاصد کو دیا اور کہا کہ میرے پاس تو یہی ماحضر ہے اور جب تک یہ موجود ہے خلیل کو سلیمان کی پروا نہیں۔ اِس کے بعد یہ اشعار لطیف فی البدیہہ

---

[۵۱] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۸۵ [۵۲] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۹۱ [۵۳] تذ۔ ج ا صفحہ ۲۵۸

تصنیف کرکے اُس کے حوالے کئے ؎

ابلغ سلیمان انی عنه فی سعة — وفی غنی غیر انی لست ذا مال
سخی بنفسی انی لا اری احدا — یموت هزلا ولا یبقی علی حال
والفقر فی النفس لا فی المال تعرفه — ومثل ذلك الغنی فی النفس لا المال
فالرزق عن قدر لا العجز ینقصه — ولا یزید له فیه حول محتال[۵۱]

شہر دمشق ایک صدی تک دولت بنی اُمیہ کا دارالخلافہ رہا تھا اس لئے خارجیت کا وہاں بڑا زور تھا۔ امام نسائی (جن کی سُنن صحاح ستہ میں شامل ہے) جب وہاں تشریف لے گئے تو ایک روز مسجد میں ایک شامی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت معاویہ کے فضائل کیا کیا ہیں۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ تو اس کو کافی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی جان بچا لے جائیں۔ جو تو اُن کے مناقب پوچھنے چلا ہے۔ اس فقرے کو سُن کر دمشقی بھڑک اُٹھے اور اس قدر ضربیں امام نسائی کے ایک نازک مقام پر ماریں کہ وہ بیہوش ہو گئے۔ حالتِ بیہوشی میں اُن کے رفقا اُن کو مسجد سے باہر لائے اور اُسی دردناک صدمے سے اُس امام حدیث نے وفات پائی[۵۲]۔ امام سلفی کے درس میں ایک دن بادشاہ مصر مع اپنے بھائی کے آکر شریک ہوا اور وہاں بیٹھ کر بھائی سے باتیں کرنے لگا۔ یہ سوء ادب دیکھ کر امام موصوف نے بادشاہ کو سرزنش کی اور فرمایا کہ ہم حدیث نبوی اس لئے نہیں پڑھ رہے ہیں کہ تم یہاں بیٹھ کر باتیں کرو[۵۳]۔ ابو غالب لغوی نے جب اپنی کتاب فن لغت میں تصنیف کی تو امیر مجاہد مرشیہ کے با اقتدار فرمان روا نے اپنے ایک معتمد کے ہات ایک ہزار اشرفیاں اُن کے پاس بھیجیں اور یہ فرمائش کی کہ کتاب مذکور کے دیباچے میں یہ الفاظ درج کردیں مما الفه ابو غالب لابی الجیش

---

۵۱ نزہتہ صفحہ ۵۷ ۔ ۵۲ تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۶۹ ۔ ۵۳ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۹۶

مجاھد یعنی اس کتاب کو ابو غالب نے امیر مجاہد کے لئے تصنیف کیا ہی۔ ابو غالب نے عطیہ شاہی واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ساری دنیا مجھ کو دی جائے تو بھی میں جھوٹ بولنا روا نہیں سمجھونگا۔ میں نے یہ کتاب خاص کر امیر کے واسطے تالیف نہیں کی بلکہ عام نفع کے خیال سے لکھی ہی۱؎۔ ابن السکّیت مصنف اصلاح المنطق خلیفہ بغداد متوکل کی خدمت میں حاضر تھے کہ خلافت کے تحتِ جگر معتز اور مؤید نمودار ہوئے متوکل نے اُن سے پوچھا کہ یعقوب تم کو کون زیادہ محبوب ہی میرے یہ دونوں بیٹے یا حسنینؓ۔ ابن السکیت نے جواب دیا کہ واللہ حضرت علیؓ کا خادم قنبر تم سے اور تمھارے دونوں بیٹوں سے کہیں بہتر ہی۔ کیا اس تصریح کی ضرورت ہی کہ خلیفہ کے دل میں ان الفاظ نے کیا تاثیر کی۔ جس زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے وہ خلیفہ کے حکم سے باہر نکال لی گئی اور زبان کے ساتھ روح نے بھی جسم سے مفارقت کی۲؎۔ قاضی ابن رشد مشہور فلسفی جب امیر منصور خلیفہ اندلس کے حضور میں کوئی علمی مسئلہ بیان کرتے تھے تو نشۂ کمال اُن کے دل سے خلیفہ کی عظمت مٹا دیتا اور ان معمولی الفاظ سے خطاب کرتے اسمع یا اخی یعنی سُن اے بھائی۳؎۔ مولانا شمس الدین رومی کی عدالت میں ایک معاملے میں سلطان بایزید نے شہادت دی تو شہادتِ سلطانی کو اُنھوں نے قبول نہیں کیا۔ جب سلطان نے وجہ پوچھی تو مولانا نے جواب دیا کہ سلطان نماز میں جماعت کا پابند نہیں اور تارک جماعت کی شہادت مردود ہی۴؎۔ سلطان محمدؒ خان نے ایک بار اپنا موسوم (مراسلہ) قاضی بروسہ مولانا شمس الدین کورانی کے پاس بھیجا۔ اُس میں کوئی بات خلاف شرع درج تھی۔ مولانا اس کو دیکھ کر اتنا برافروختہ ہوئے کہ سلطانی فرمان پھاڑ کر لانے والے کو باہر نکال دیا۔ سلطان کو اُن کی یہ حرکت بہت ناگوار ہوئی اور غضب سلطانی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مولانا کو عہدۂ قضا

۱؎ ابن ج ۱ صفحہ ۹۷ ۲؎ ابن ج ۲ صفحہ ۳۰۹ و ۳۱۱ ۳؎ عیون ج ۲ صفحہ ۷۶ ۴؎ شقائق ج ۱ صفحہ ۴۳

کے ساتھ سلطنت روم بھی چھوڑنی پڑی[۵۱]۔ مولانا ابن خطیب ایک روز عید کی مبارک باد دینے ایوان سلطانی کو گئے۔ اُن دنوں وہ خزانۂ سلطنت کے وظیفہ خوار بھی تھے۔ اور سو درہم یومیہ اُن کو ملتے تھے۔ جب دربار کو چلے تو چند طلبہ ہمرکاب تھے۔ حضور سلطانی میں پہنچے تو سلطان نے ازراہِ حُسنِ اخلاق سات قدم بڑھ کر استقبال کیا۔ مولانا نے بجائے جُھک کر آداب بجالانے کے سلام کیا اور بجائے دست بوسی کے مصافحہ۔ اُن کے ایک شاگرد کو اُستاد کا یہ خلاف آداب برتاؤ ناگوار گزرا اور واپسی میں اُن سے کہا کہ آخر سلطان فرمانروائے وقت ہیں کچھ تو آپ کو جھکنا تھا۔ ابن خطیب نے فرمایا کہ آیا یہ فخر سلطان کے لیے کم ہے کہ ابن خطیب سا فاضل اُن کے پاس گیا۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ سلطان اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں[۵۲]۔ مولانا یوسف قاضی قسطنطنیہ ایک دن مسجد سے نماز پڑھ کر نکلے تو دروازے پر صدر اعظم کے چوبدار کو حاضر پایا جو اُن کے بلانے کو آیا تھا۔ اُس وقت مولانا کی سر پر چھوٹا سا عمامہ تھا۔ چھوٹا عمامہ باندھ کر بارگاہِ وزارت میں جانا خلافِ ادب تھا۔ مگر خدا پرست مولانا کے دل نے گوارا نہ کیا کہ رب العزت سے زیادہ ادب اُس کے ایک بندے کا کریں اُسی عمامے کو باندھے صدر اعظم کے حضور میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو اعتراض ہوا۔ اُنھوں نے راست بازی سے اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا جس کو سُن کر وزیر اعظم نے بہت پسند کیا اور حضور سلطانی میں اُس کی نقل کی[۵۳]۔

معاصرین اور ہمچشموں کے مقابلے میں

عربی کا ایک مقولہ ہے المعاصرۃ سبب المنافرۃ یعنی ہمعصری باہم نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ عادت قریباً طبیعت ہو چکی ہے کہ جو ہم فن اہل کمال ایک ہی زمانے میں ہوتے ہیں وہ

---

۵۱ شق-ج ۱-صفحہ ۹۱ ۵۲ شق-ج ۱-صفحہ ۱۶۲ ۵۳ شق-ج ۱-صفحہ ۲۳۴

ایک دوسرے کے کمال کا اعتراف کما حقہ نہیں کرتے، الاماشاءاللہ جب ایک ہی عہد کے دو ہم فن اہل کمال کے دل ٹٹولے جائیں تو اُن کی باہمی بے پروائی رقابت کے اثر سے کم وبیش پرخاش و مغائرت کی حد تک ترقی کیے ہوئے نظر آئے گی۔ شیخ سعدی کے زمانے میں ایک[1] اور فارسی کا شاعر امامی ہروی تھا۔ اُس زمانے کے لوگ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ باکمال ہے۔ چنانچہ ہمگر شیرازی ایک تیسرا شاعر اس بارے میں حکم قرار دیا گیا اور اُس نے امامی کو سعدی سے افضل بتایا۔ یہ ایسا غلط فیصلہ تھا جس کے غلط ہونے میں گزشتہ چھ سو برس کے عرصے میں شاید کسی کو کلام ہوا ہو۔ مگر معاصرت کے اثر نے ہمگر کو اس غلطی کا ادراک نہیں ہونے دیا۔ ہم جن علما کے حالات آپ کو سنا رہے ہیں اُن کے جوشِ حق پرستی نے کبھی معاصرین کے فضل وکمال سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ وہ بزرگ جوہر اور کمال کے پرکھنے والے تھے اور جن میں یہ جوہر ہوتا تھا اُن کے معاصر کا عمر میں چھوٹا طبقے میں نیچا مذہباً مخالف ہونا اُن کی قدر شناسی کو کم نہیں کر سکتا تھا۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقے میں عالی۔ لیکن جب اُن سے ملے تو اُس ادب سے ملے جیسے چھوٹے بڑوں سے ملتے ہیں۔ شاعر مشہور ابو اسحٰق عقیدے کا صابی تھا مگر جب وہ مرا تو محض قدر دانیٔ کمال کے لئے ہاشمی نصب شریف رضی نے اس کا مرثیہ لکھا اور لوگوں کے طعن کی کچھ پروا نہیں کی۔ معاصرین کے فضل وکمال کا اعتراف اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ علی الاعلان اُن کو اپنے آپ سے زیادہ عالم و کامل بتائیں۔ اُن کی جلالت کے سامنے اپنی بے مائگی کا اقرار کریں اور جب کوئی مشکل پیش آئے تو اُن سے اُس کے حل کردینے

---

[1] ستارہ پرست

کا سوال یا آن کہ وہ ان کی تصانیف پر اعتراض کریں تو شکریہ ادا کیا جائے اور دعائے خیر سے یاد۔ ایک موقع پر امام شعبی آں حضرت کے عہد مبارک کے جنگی معرکوں کو بیان کر رہے تھے اتفاقاً حضرت ابن عمر کا گزر کر اُسی راستے سے ہوا۔ امام ممدوح کا بیان سُن کر فرمایا کہ جس قوم کا یہ ذکر کر رہے ہیں میں اُس کے دیکھنے والوں میں ہوں لیکن مغازی یہ مجھ سے زیادہ اور بہتر جانتے ہیں[۱]۔ حضرت امام باقر نے ایک مرتبہ فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی شخص حج کے مسائل عطا سے بہتر نہیں جانتا[۲]۔ حضرت امام زین العابدین اپنے ایک شاگرد زید ابن اسلم کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ لوگوں نے اس پر تعجب ظاہر کیا تو پاک نفس امام نے فرمایا کہ جس کی صحبت میں دین کا نفع ہوتا ہے اُس کے پاس انسان بیٹھتا ہی ہے[۳]۔ ایک دفعہ کا ذکر سُنیئے کہ مدینۂ طیبہ میں امام زہری امام ربیعہ کا ہات پکڑ کر ایک مکان میں لے گئے اور وہاں دونوں نے ایک دوسرے کے علم کو جانچا۔ جب عصر کے وقت وہ دونوں امام زمانہ باہر تشریف لائے تو زہری یہ کہتے نکلے کہ ربیعہ کا مثل مدینہ میں نہیں اور ربیعہ یہ فرماتے آئے کہ زہری کے رُتبے کو کوئی نہیں پہنچا[۴]۔ ابن اسحٰق اصفہانی جب بصرے گئے اور وہاں کے محدثین سے حدیث پڑھنی چاہی تو سب نے پوچھا کہ تمھارے شہر میں عباس ابن یزید نہیں ہیں؟ انھوں نے کہا ہیں تو فرمایا اُن کے ہوتے ہوئے تم ہمارے پاس کیوں آئے[۵]؟ اس واقعے سے واضح ہوتا ہے کہ اُس عہد مبارک میں افراد نہیں بلکہ گروہ کے گروہ حق کے گرویدہ تھے اور حسن تعلیم نے سب کے مذاق یکساں پاک صاف کر دیے تھے۔ امام عمرو ابن دینار امام زہری کے کمالات کا شہرہ سُن کر فرمایا کرتے تھے کہ زہری کے پاس دھرا کیا ہے۔ میں نے ابن عمر کو دیکھا ہے اُنھوں نے نہیں دیکھا میں نے ابن عباس کو دیکھا ہے

---

[۱] تذ-ج ا صفحہ ۷۱ [۲] تذ-ج ا صفحہ ۸۶ [۳] تذ-ج ا صفحہ ۱۱۹ [۴] تذ-ج ا صفحہ ۹۶ [۵] تذ-ج صفحہ ۸۶

اُنھوں نے نہیں دیکھا۔انداز کلام صاف کہہ رہا ہے کہ ابن دینار کو کمال کا غرّہ زہری سے نیاز کر رہا تھا۔حُسن اتفاق کہ اُسی عرصے میں امام زہری کا مکۂ مکرمہ میں گزر ہوا۔جب ابن دینار نے یہ خبر سُنی تو با وجود پاؤں سے معذور ہونے کے فوراً ملاقات کو تیار ہوئے اور خدام سے فرمایا کہ مجھ کو امام زہری کے یہاں لے چلو۔ملازموں نے تعمیل ارشاد کی اور امام ممدوح کی خدمت میں لے آئے جب ملے تو زیادہ گرویدہ ہوئے اور شب کو وہیں رہے۔صبح کو واپس آئے تو شاگردوں نے سوال کیا کہ کہئیے امام زہری کو کیسا پایا۔اگلی رائے کو انصاف مغلوب کر چکا تھا فرمایا کہ وَاللّٰہِ مَا رَأَیتُ مِثْلَ ھٰذَا القُرَشِیّ اَبَداً یعنی میں نے اس قریشی کا مثل کبھی نہیں دیکھا[١]۔مولانا ابن مؤید رومی جب محقق دوّانی کے پاس گئے تو محقق نے اُن سے سوال کیا کہ روم سے ہمارے لیے کیا ہدیہ لائے۔مولانا نے علامہ خواجہ زادے کی تازہ تصنیف کتاب تہافہ پیش کی۔محقق نے اوقات فرصت میں مطالعہ کیا۔جب تمام و کمال دیکھ چکے تو مولانا نے ابن مؤید سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ تم کو اور اس رسالے کے مصنف کو جزائے خیر دے۔میں بھی اس مبحث پر ایک کتاب لکھنے کے خیال میں تھا۔مگر اللہ نے شرم رکھ لی۔اگر میں اس کتاب کے دیکھنے سے پہلے لکھ چکا ہوتا تو بڑی ہنسی ہوتی[٢]۔جب تک حضرت سالم ابن عبداللہ زندہ رہے امام نافع نے فتویٰ نہیں دیا[٣]۔حضرت سعید ابن المسیّب کے پاس جب کوئی حاجت مند فتویٰ پوچھنے جاتا تو امام ممدوح فرماتے کہ سلیمان ابن یسار کے پاس جا کر پوچھو اس لیے کہ آج وہ سب سے زیادہ عالم ہیں[٤]۔حضرت قاسم (ابن محمد ابن ابی بکرؓ) سے کسی نے پوچھا کہ آپ زیادہ عالم ہیں کہ سالم (ابن عبداللہ ابن عمرؓ) تو اُنھوں نے فرمایا کہ یہ مرتبہ سالم ہی کو حاصل ہے[٥]۔فراء نحوی اپنے ہم عصر اخفش اوسط

---

[١] ابن۔ج ١ صفحہ ١٤٥ [٢] شق۔ج ١ صفحہ ٥٠ [٣] تذ۔ج ١ صفحہ ٨٠ [٤] ابن۔ج ١ صفحہ ٢١٣ [٥] ابن ج ١ صفحہ ٢١٤

سے ملنے گئے تو اخفش نے حاضرین سے کہا کہ تمھارے پاس لغت اور عربیت کا سردار آیا۔ فرا نے کہا کہ جب تک اخفش زندہ ہیں اُس وقت تک نہیں[۵۱]۔ حضرت عبدؓاللہ ابن مسعود کو جب ضرورت پیش آتی تو وہ زر ابن حُبیش سے عربیت کے متعلق باتیں دریافت فرمالیا کرتے[۵۲]۔ قابوس نے جب اپنے والد سے یہ سوال کیا کہ آپ صحابۂ کرام کی موجودگی میں علقمہ (تابعی) کے پاس کیوں جایا کرتے تھے تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اس لیے جایا کرتا تھا کہ میں نے بعض صحابہ کو دیکھا تھا کہ وہ علقمہ کے پاس تشریف لے جاکر مسائل دریافت فرماتے تھے[۵۳]۔ خواجہ حسن بصری کو جب کوئی مشکل پیش آجاتی تو بذریعہ تحریر حضرت سعید ابن المسیب سے دریافت فرمالیتے[۵۴]۔ امام ابو احمد کو فن حدیث میں ایک بار اشکال پیش آیا تو اُنھوں نے اپنے معاصر ابن مندہ سے نیشاپور خط بھیج کر حل کرلیا[۵۵]۔ حضرت ابن عمر اکثر امام مجاہد (تابعی) کے گھوڑے کی رکاب تھام لیا کرتے تھے[۵۶]۔ اشہب ابن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہؓ کو امام مالک کے حضور میں ایسا مؤدب بیٹھا دیکھا جیسے چھوٹے بڑوں کے سامنے بیٹھتے ہیں[۵۷]۔ امام اعظم امام مالک سے عمر میں تیرہ برس بڑے تھے اور طبقہ میں بھی اُن سے عالی ہیں اسی واسطے امام ذہبی واقعۂ بالا کو نقل کرکے فرماتے ہیں کہ "اس سے امام ابوحنیفہؓ کے حُسن ادب اور تواضع کی کیفیت معلوم ہوتی ہے"۔ اور حق یہ ہے کہ اُن بزرگوں کی عظمت کے اصلی اسباب یہی صفات تھیں۔ حسن ابن علی کہتے ہیں کہ جب وکیع بغداد میں آئے تو میں نے اپنے والد امام احمد ابن حنبل یحییٰ ابن معین اور ابن سالم کو اُن کے سامنے ایسا بیٹھا دیکھا جیسے بچے بیٹھے ہوں[۵۸]۔ امام احمد ابن حنبل کے پاس ایک بار امام ذہلی آئے تو امام ابن حنبل اُن کی تعظیم کے لئے

---

۵۱ ابن-ج ا صفحہ ۲۰۸ ۵۲ تذ-ج ا صفحہ ۹۴ ۵۳ تذ-ج ا صفحہ ۲۴ ۵۴ تذ-ج ا صفحہ ۴۷

۵۵ تذ-ج ۳ صفحہ ۲۳۷ ۵۶ تذ-ج ا صفحہ ۸۰ ۵۷ تذ-ج ا صفحہ ۱۸۹ ۵۸ تذ-ج ۲ صفحہ ۶۴

کھڑے ہوگئے دونوں اماموں کے رُتبے میں اس قدر فرق تھا کہ لوگوں کو اس تعظیم سے حیرت ہوئی امام ممدوح نے صرف تعظیم ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اپنے صاحبزادوں اور تلامذہ کو حکم دیا کہ اُن سے جاکر حدیث حاصل کریں[۵۱]۔ سفیان ابن عیینہ سے کسی نے کہا کہ شہر میں حسین ابن جعفی آئے ہیں۔ ابن عیینہ یہ سُن کر بے اختیار کھڑے ہوگئے اور فوراً ابن جعفی سے جاکر ملے، اُن کے ہاتھ چومے اور فرمایا کہ آج یہاں ایسا شخص وارد ہوا ہے جس کی فضیلت سب سے بڑھی ہوئی ہے[۵۲]۔ سُننے کے قابل یہ بات ہے کہ ابن عیینہ ابن جعفی سے بیس برس تو عمر میں بڑے تھے اور طبقۂ عالی ایا م محمد اور امام شافعی میں جس قدر جزئیات میں اختلاف ہے ظاہر ہی ہے باایں ہمہ امام محمد حنفی امام شافعی کی تکریم کرتے تھے اتنی کسی عالم کی نہیں کرتے تھے[۵۳]۔ امام بوشنجی کسی جنازے کی نماز پڑھانے تشریف لے گئے تھے جب واپس ہونے لگے تو امام ابوعمرو نے اُن کی گھوڑے کی بھاگ تھامی۔ امام ابن خزیمہ نے رکاب اور امام جارودی نے چارجامہ درست کیا[۵۴]۔ شیخ ابو اسحٰق شیرازی اپنے معاصر امام الحرمین سے ایک موقع پر یوں خطاب کر رہے تھے یا مفید اہل المشرق والمغرب انت الیوم امام الائمۃ یعنی اے مشرق و مغرب کے لوگوں کو فائدہ پہنچانے والے آج تم سارے اماموں کے امام ہو[۵۵]۔ حق پسندی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ حاکم نیشاپوری محدث مشہور نے فن حدیث میں ایک کتاب المدخل فی الصحیح لکھی تھی۔ امام عبدالغنی مصری نے اُس کا رد لکھا۔ حاکم نے جب یہ رد دیکھا تو امام مصر کی خدمت میں شکریے کا خط بھیجا اور اُن کے حق میں دعائے خیر کی[۵۶]۔ ذیل کی متفرق حکایتیں بھی ہمارے مدعا کو کسی نہ کسی پہلو سے ثابت کرتی ہیں۔ ابو اسحٰق شاعر مشہور نے جب وفات

---

۵۱ تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۱۲ ۵۲ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۲ ۵۳ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۴۷۴

۵۴ تذ۔ ج ۲ صفحہ ۲۳ ۵۵ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۸۷ ۵۶ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۵۰

پائی تو شریف رضی نے مرثیہ لکھا۔ لوگ یہ سُن کر بگڑے اور کہا کہ افسوس ہو کہ خاندان نبوت سے ہو کر اُنھوں نے ایک صابئی کا مرثیہ لکھنا روا سمجھا۔ شریف ممدوح نے یہ اعتراض سُنا تو فرمایا اور کیا خوب فرمایا انما رثیت فضلہ (میں نے تو اُس کے کمال کا مرثیہ لکھا ہے)

الحق ہ

اِنَّمَا یعرِف ذاالفضل
مِنَ النَّاس ذوُوہُ

حضرت سہل ابن عبداللہ تستری امام ابو داؤد کے پاس (جن کی سنن داخل صحاح ستہ ہی) تشریف لے گئے۔ امام نے اُن کو اہلاً وسہلاً کہہ کر لیا اور تعظیم سے بٹھایا جب حضرت ممدوح بیٹھ لئے تو امام موصوف سے فرمایا کہ میں ایک کام کے واسطے حاضر ہوا ہوں۔ ابو داؤد نے ارشاد کیا کہ فرمائیے۔ حضرت سہل نے کہا کہ جب تک یہ وعدہ نہ ہو جائے کہ حتی الامکان میری درخواست مقبول ہو گی میں نہ کہونگا۔ امام حدیث نے جب یہ منظور فرمالیا تو اُنھوں نے کہا کہ اپنی زبان جس سے احادیث نبویہ آپ نے روایت کی ہیں نکالیئے تاکہ میں اُس کو چوم لوں چنانچہ اُنھوں نے اپنی زبان نکالی اور اُنھوں نے چوم لی۔[۲] مبرد اور ثعلب ادب کے دو مشہور اماموں میں بوجہ معاصرت چشمک تھی۔ جب مبرد کے انتقال کی خبر سُنی تو ثعلب نے بہت تاسف کیا اور ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے بعض اشعار یہ ہیں[۳]

ذَھَبَ[۳] المبرد وانقضت ایامہ   وَلَیَذھبَنَّ مع المبرد ثعلب
بیتٌ مِنَ الأداب اَضحٰی نصِفہٗ   خَرِبًا وباقی النصف منہ سیخرب
فتزودوا من ثعلب فبکاٴس ما   شَرِبَ المبردُ عَنْ قریب یَشرَبُ[۴]

---

[۱] ابن سج ا صفحہ ۱۳ [۲] ابن سج ا صفحہ ۲۱۴ [۳] مبرد گیا اور اُس کی زندگی کے دن گزر گئے :: مبرد کی رفاقت میں ثعلب بھی ضرور جائیگا :: ادب کا گھر آدھا تو ویران ہو گیا :: جو آدھا باقی ہو وہ بھی خراب ہوا چاہتا ہو :: ثعلب کا دم غنیمت سمجھو کہ جو تلخ گھونٹ مبرد نے پیا ہو ثعلب بھی عنقریب پینے والا ہو۔ [۴] نزہۃ صفحہ ۲۸۷ و ۲۹۳

اُس زمانے کی حق پسندی کی ایک مثال خطیب بغدادی کے دفن سے متعلق ہی۔ خطیب کا وقت وفات جب قریب ہوا تو اُنھوں نے وصیت کی کہ میری قبر بشر حافی کے مزار کے قرب میں بنائی جائے۔ بعد وفات محدثین نے ہرچند تلاش کی مگر کوئی جگہ اُس بابرکت قبر کے قریب نہ ملی صرف ایک لحد تھی جو صوفی ابن زہرا نے حالت حیات میں اپنے واسطے تیار کرائی تھی۔ ہر ہفتہ ایک بار وہ اُس میں جاکر لیٹتے اور کلام مجید ختم کرتے جس کنجِ مزار کو اس محنت سے اُنھوں نے پاک بنانا چاہا تھا خطیب کے وصیوں نے آخر اُسی کو تاکا اور اُن سے استدعا کی۔ ظاہر ہی کہ یہ کب قبول کرتے۔ وہ بزرگ گروہ مایوس ہوکر اُن کے والد کے پاس گیا اور حال بیان کیا باپ نے بیٹے کو بلا بھیجا۔ جب یہ آئے تو کہا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ قبر دیدو، مگر ایک بات پوچھتا ہوں۔ فرض کرو کہ تم کسی موقعے پر بشر حافی کے پاس بیٹھے ہوتے اور خطیب وہاں آتے تو تم کیا پسند کرتے کہ خطیب تم سے بائیں میں بیٹھ جائیں۔ ابن زہرا نے کہا کہ نہیں میں اپنی جگہ اُن کے واسطے خالی کر دیتا۔ نکتہ شناس باپ نے کہا کہ بس یہی معاملہ بعد رحلت ہونا چاہیے۔ صاف دل صوفی کے دل میں یہ بات اثر کر گئی اور اُنھوں نے وہ قبر بطیب خاطر دیدی[1]

عفان ابن مسلم محدث انصاری کو ایک دفعہ دس ہزار[2] اشرفیاں اس غرض سے دی گئیں کہ فلاں شخص کی نسبت وہ قاضی کی عدالت میں جرح و تعدیل نہ کریں۔ مگر اُنھوں نے فرمایا کہ میں کسی کے حق کو باطل نہیں کر سکتا اور یہ کہہ کر اشرفیاں واپس کر دیں[3]

اپنے نفس کے مقابلے میں

یہ بیان عنوان حق پسندی کا اگرچہ آخری حصہ ہی لیکن اہمیت اور دشواری میں پچھلے دونوں بیانوں سے بڑھا ہوا ہی۔ برہنہ شمشیر کے مقابلے میں حق کو نہ چھوڑنا اتنا مشکل نہیں جتنا یہ مشکل ہی کہ انسان

۱؎ ابن خ ج ا صفحہ ۱۳ ۲؎ ایک اشرفی اگر دس روپیہ کی رکھی جائے تو ایک لاکھ روپے ہوتے ہیں ۳؎ تذ جلد ا صفحہ ۳۴۸

اپنے نفس کی بُرائیاں ازراہ انصاف قبول کرلے یا آں کہ شہرۂ آفاق باکمال اپنے ایک
معاصر کے فضل و علم سے اپنے فضل کو کم مان لے۔ اولاد اور جان دنیا میں بہت عزیز چیزیں
ہیں مگر جو اولاد نافرمان ہو جاتی ہے وہ دشمن سے زیادہ بُری معلوم ہونے لگتی ہے اور زندگی
جب دل کو ستانے لگتی ہے یا کوئی حالت ایسی پیش آجاتی ہے جس کا نفس متحمل نہیں ہو سکتا
تو انسان بے دھڑک اپنی حیات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تاریخ میں ایک ایسے جوانمرد بادشاہ کا ذکر
ہے جس نے آٹھ ہزار جرار فوج کے مونھ پھیر دئیے تھے اور اُس وقت اُس کی عمر صرف
اٹھارہ برس کی تھی۔ لیکن یہ اولوالعزم فرمان روا اپنے نفس کے مقابلے میں ہمیشہ مغلوب
رہا۔ یکے بعد دیگرے فاحش غلطیاں اُس نے کیں اُس کے مشیر سر دھنتے رہے مگر کبھی
اُس سے یہ نہ ہو سکا کہ اپنی غلطیوں کو غلطی مان کر راہِ صواب اختیار کر لیتا۔ آفرین ہے اُن
علمائے سلف پر جنھوں نے اپنے نفس کی خود پسندی کو قابو میں رکھا اور کبھی حق پر غالب
نہیں ہونے دیا۔ فقہ کی کتابیں اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں کہ اُمت کے پیشوا اماموں نے
کسی مسئلے میں اپنی رائے ایک ظاہر کی اور عقیدت کی مدد سے وہ مشرق و مغرب میں پھیل گئی
اور سارے عالم میں اُس پر عمل ہونے لگا۔ پھر جب اُن کو اپنی رائے کی غلطی محسوس ہوئی تو
علی الاعلان اُس کو چھوڑ دیا۔ اِس کی نظیریں ابھی عرض کی جائیں گی کہ بڑے جلیل القدر
اماموں نے اپنے شاگردوں کی شاگردی کی ہے۔ ایسے بھی پاک نفس بندے تھے جو کسی فن
میں مشہور روزگار ہوتے تھے اور جب اُن کے سامنے اُسی علم کا کوئی ایسا سوال پیش کیا جاتا
جس کا جواب اُنھیں معلوم نہ ہوتا تو وہ بدون کسی پس و پیش کے سائل سے فرما دیتے تھے لا
ادری یعنی میں نہیں جانتا۔ امام شافعی جن کی رائے پر لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں
نے اپنے دین و دنیا کو چھوڑ دیا ہے اپنی عقل و رائے کی نسبت یہ فرماتے ہیں ؎

کلما ادّبنی الدھر اراني نقص عقلی ؛ واذا ما ازددت علماً زادنی علمی بجہلی

یہ باتیں کہنے کو تھوڑی اور چھوٹی ہیں مگر کرنے کو بڑی ہیں اور بہت بڑی۔ سلیمان بن یسار فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس دونوں کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ابن عمر اکثر سوالوں کے جواب میں لاادری فرما دیتے تھے مگر حضرت ابن عباس کسی سائل کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اُن کو تعجب آتا تھا کہ عبداللہ ابن عمر کیوں لاادری کہہ کر لوگوں کو ناکام واپس کر دیتے ہیں۔ اور فرماتے تھے کہ جو مسائلہ مشتبہ پیش آئے اُس میں اوّل تو سنت کو تلاش کرنا چاہیے اور اُس کے مطابق حکم دینا اور اگر صریح سنت نہ ہو تو اپنے اجتہاد سے مدد لیں۔ اتفاق زمانہ کہ ایک روز کوئی مسائلہ اُن کے سامنے ایسا پیش ہوا جس کے جواب میں حضرت ممدوح متحیر رہ گئے اُس وقت اُن کو اپنا وہ مقولہ یاد آیا جو حضرت ابن عمر کے مقابلے میں فرمایا کرتے تھے اور از راہ انصاف ارشاد کیا کہ البلاء[1] موکل بالقول[2] حدیث کے عالی مرتبہ امام شعبی بھی اکثر سوال کے وقت لاادری کہہ دیتے تھے۔ اُن کا قول ہے کہ ہم فقیہ نہیں ہیں ہم نے تو بس یہی کیا ہے کہ جو حدیث سُنی اس کو روایت کر دیا۔ فقہا وہ ہیں جو علم پر عمل بھی کرتے ہیں جلیل القدر تابعی حضرت عطا کے پاس ایک روز ابن ابی لیلیٰ گئے تو حضرت عطا نے اُن سے بعض مسائلے از راہ استفادہ دریافت کئے جو لوگ اُن کی شانِ امامت سے واقف تھے اُن کو تعجب ہوا کہ ابن ابی لیلیٰ سے عطا استفادہ کریں۔ حضرت عطا نے سُنا تو فرمایا کہ حیرت کیا ہے۔ ابن ابی لیلیٰ مجھ سے زیادہ عالم ہیں[3]۔ اُن بزرگوں کی پاک نفسی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے شاگردوں کے مقابلے میں اپنے علم و کمال کو کمتر سمجھتے تھے۔ ابن عیینہ نے اپنے شاگرد علی ابن مدینی کی نسبت ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگو تم مجھ کو

---

[1] بولنا بلا میں ڈالتا ہے [2] تذ۔ ج ا صفحہ ۳۳ [3] تذ۔ ج ا صفحہ ۸۷۔ [4] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۵۴

ابن مدینی کے ارتباط پر ملامت کرتے تھے ہو۔ واللہ وہ مجھ سے جتنا علم حاصل کرتے ہیں اُس سے زیادہ میں اُن سے سیکھ لیتا ہوں[1]۔ یحییٰ ابن معین اپنے شاگرد امام ابن حنبل کی نسبت فرماتے ہیں کہ یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مثل احمد ابن حنبل کے ہو جاؤں۔ قسم ہے اپنے رب کی میں اُن کے مرتبے کو نہیں پا سکتا[2]۔ حماد ابن زید کا اپنے معاصر شُعبہ کے بارے میں یہ قول تھا کہ جب حدیث میں میری اور شعبہ کی رائے میں مخالفت آ پڑتی ہے تو میں اپنی رائے چھوڑ کر شعبہ کا قول اختیار کر لیتا ہوں۔ اس لیے کہ شعبہ شیخ سے ایک حدیث بیس دفعہ سُن کر بھی سیر نہیں ہوتے تھے اور میں ایک بار کے سُن لینے پر قانع ہوں[3]۔ امام شعبہ فرماتے تھے کہ سفیان احفظ منی یعنی سفیان کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ اُن کے عہد میں اس فنِ پاک کا کمال حفظ پر موقوف تھا لہٰذا امام شعبہ کا حضرت سفیان کو اپنے آپ سے زیادہ حافظ حدیث بتانا گویا یہ کہنا ہے کہ وہ زیادہ عالم ہیں[4]۔ امام اوزاعی شام کے مقتدا ایک روز امام فزاری کو خط لکھوانے لگے تو کاتب سے فرمایا کہ اوّل[5] اُن کا نام لکھنا اس لئے کہ واللہ وہ مجھ سے بہتر ہیں۔ خواجہ حسن بصری نے کسی موقع پر بیان فرمایا تھا کہ منافق کو تین علامتوں سے پہچان لیا کرو جب وہ بات کہے تو جھوٹ بولے۔ کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے۔ وعدہ کرے تو خلاف وعدگی کرے۔ حضرت عطا نے اُن کا یہ قول سُنا تو اعتراض کیا کہ حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں یہ تینوں صفتیں تھیں۔ اُنھوں نے جھوٹ بولا۔ امانت میں خیانت کی اور وعدہ خلافی بھی کی۔ با ایں ہمہ خدا تعالیٰ نے اُن کو نبوّت کا درجہ بخشا۔ لگانے والے تو بُرے ہوتے ہیں کسی نے حضرت عطا کا یہ اعتراض خواجہ صاحب کے کان ڈال دیا۔ پاک نفس خواجہ نے یہ سُن کر

---

[1] تذ-ج ۲-صفحہ ۱۶ [2] تذ-ج ۲-صفحہ ۱۹ [3] تذ-ج ۱-صفحہ ۱۷۵ [4] تذ-ج ۱-صفحہ ۱۸۴ [5] عربی میں خط کے آغاز میں لکھتے ہیں من فلان الی فلان۔ یعنی فلاں شخص کی جانب سے فلاں شخص کو [6] تذ-ج ۱-صفحہ ۲۴۹

ازراہِ انصاف فرمایا کہ وفوق[۵۱] کُلّ ذی علمٍ علیم[۵۲]۔ لوگوں کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ہمارے امام ابوحنیفہ کی (جن کو دربارِ فضل سے امامِ اعظم کا خطاب ملا ہے) ایک ادنٰی پیشہ ور حجّام نے پانچ غلطیاں پکڑی تھیں۔ امام اعظم نے اُس حجّام کی یہ قدر کی کہ اس واقعے کو خود سُنا کر قیامت تک اُس کا نام کر دیا۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ ایام حج میں میں نے ایک حجام سے حجامت بنوانے کا قصد کیا۔ جب میں اُس سے اُجرت ٹھہرانے لگا تو اُس نے کہا کہ مناسک[۵۳] کی اُجرت نہیں ٹھہرائی جاتی۔ اُس نے حجامت بنانی شروع کی تو میرا مونھ قبلہ کی جانب نہ تھا۔ اُس پر حجام نے کہا کہ قبلہ رُخ ہو بیٹھو۔ میں نے بائیں طرف سے حجامت بنوانے کا ارادہ کیا تو بولا حجامت سیدھی جانب سے اوّل بنوائی جاتی ہے۔ وہ اپنے کام میں مشغول تھا اور میں خاموش۔ اس پر اُس نے ہدایت کی کہ تکبیر پڑھتے جاؤ۔ حجامت سے فارغ ہو کر میں اُٹھ کر چلا تو میرے مہربان نے پوچھا کہ کہاں چلے۔ میں نے کہا کہ اپنی فرودگاہ پر جاتا ہوں۔ یہ سُن کر اُس نے کہا کہ اوّل دو رکعتیں پڑھ لو پھر قیام گاہ کا قصد کرنا۔ اب تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا کہ یہ باتیں تم کو کس نے بتلائی ہیں۔ حجام نے جواب دیا کہ میں نے حضرت عطا کا طریق عمل ایسا ہی دیکھا تھا[۵۴]۔ ائمہ حدیث کے حالات میں اس کی مثالیں کثرت سی ہیں کہ جب اُن کے شاگرد شیخ بنے تو اُنھوں نے ان سے حدیثیں حاصل کیں۔ بلکہ محدثین کا یہ قول ہے کہ انسان اُس وقت تک محدث نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اعلیٰ، ہمسر اور کمتر تینوں طبقوں سے روایت نہ کرے[۵۵]۔ بطور نمونہ ہم چند مثالیں ذیل کے نقشے میں لکھتے ہیں:۔

---

۵۱ ہر ذی علم سے بڑھ کر ایک عالم ہے

۵۲ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹

۵۳ وہ اعمال جو حج سے تعلق رکھتے ہیں

۵۴ ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۱۹

۵۵ مقدمہ صفحہ ۵۶۵

نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی	نمبر	نام امام	نام شاگرد کا جس سے حدیث روایت کی
۱	علقمہ	مقاتل (تذ جلد ۱ صفحہ ۱۵۷)	۵	ابو حنیفہ	ابراہیم ابن طہمان (تذ جلد ۱ صفحہ ۱۹۲)
۲	اعمش	سفیان ابن عیینہ (تذ جلد ۱ صفحہ ۲۳۹)	۶	لیث	عبداللہ ابن وہب (تذ جلد ۱ صفحہ ۲۷۸)
۳	ابن جریج	" "	۷	بخاری	عبداللہ ابن حماد (مقدمہ صفحہ ۵۶۵)
۴	شعبہ	" "	۸	خطیب بغدادی	ابن ماکولا (تذ جلد ۴ صفحہ ۲)

احمد ابن سلمہ کہتے ہیں کہ میں نے اسحٰق ابن راہویہ کو یہ کہتے سنا کہ خدا تعالیٰ حق کو پسند فرماتا ہے لہذا میں کہتا ہوں کہ ابو عبید (بغدادی) مجھ سے علم میں بڑھ کر ہیں اور فقہ میں زیادہ۔ ہم ابو عبید کے محتاج ہیں مگر اُن کو ہماری احتیاج نہیں[۵۱]۔ جب سلیمان حافظ حدیث بغداد میں وارد ہوئے اور امام احمد ابن حنبل نے اُن کی آمد کی خبر سُنی تو حاضرین سے فرمایا کہ چلو سلیمان سے راویانِ حدیث کا پرکھنا سیکھیں[۵۲]۔ امام ممدوح اور سلیمان کی جلالتِ شان میں جو فرقِ بیّن تھا وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک عالم محمد کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ ابن معین کا یہ مقولہ سُنا تھا کہ ہم راویانِ حدیث پر جرح کر رہے ہیں حال آں کہ ممکن ہے کہ وہی لوگ دو سو برس سے بہشت میں آسودہ ہوں ایک روز میں ابن ابی حاتم کی خدمت میں گیا تو وہ فن رجال کا درس دے رہے تھے میں نے امام ممدوح کا قول مذکور اُن کو سُنایا۔ اُن پر اس مقولے کا یہ اثر ہوا کہ رونے لگے ہاتھوں میں رعشہ آگیا اور کتاب ہاتھ سے چھوٹ پڑی۔ زار زار روتے تھے اور بار بار مجھ سے اس روایت کو کہلواتے تھے[۵۳]۔

ایام طالب علمی میں ایک روز امام دارقطنی ابن انباری کی مجلس درس میں شریک ہوئے۔ دوران املا میں ابن انباری نے ایک نام میں غلطی کی۔ دارقطنی کو اتنی جسارت نہ ہوئی کہ ابن انباری کو متنبہ کرتے مگر اُن کے مستملی کو وہ غلطی جتا دی۔ جب دوسرے جمعے کو دارقطنی پھر مجلس مذکور میں گئے تو ابن انباری نے با علان فرمایا کہ ہم نے اُس روز فلاں نام میں

---

۵۱ تذ ج ۲ صفحہ ۶ ۵۲ تذ ج ۲ صفحہ ۷۲ ۵۳ تذ ج ۳ صفحہ ۵۰

غلطی کی تھی اس نوجوان نے ہم کو آگاہ[1] کر دیا۔ جوش حق پسندی اس کو کہتے ہیں۔ اگر ابن انباری اس راز کو فاش نہ کرتے تو شاید دنیا کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی مگر انھوں نے یہ خیال فرمایا کہ اپنی ایک خطا ظاہر ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ جو نوجوان طالب علم دل بڑھاتے جانے کا مستحق ہے اُس کی حق تلفی نہ ہونی چاہیے حافظ ابن خیرون کو کسی نے حافظ لکھا تو وہ بگڑ گئے[2] اور فرمایا کہ میری کیا ہستی ہے جو مجھ کو حافظ لکھا جائے۔ آج کل کے "محمد فاضل" اپنے نام کے اوّل میں مولوی لکھا دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ حق بمقدار رسید سلجوق کے بلند پایہ وزیر نظام الملک طوسی نے جو نظامیہ مدرسہ بغداد میں قایم کیا تھا اُس میں شیخ ابو اسحٰق شیرازی اور امام حجۃ الاسلام غزالی جیسے اکابر مدرس رہے تھے۔ فخر الاسلام شاشی جب اُس کے مدرس مقرر ہوئے تو پہلے روز مسند تدریس پر متمکن ہونے کے بعد اُن اکابر کا خیال آیا جو اُس مسند کی عزت بڑھا چکے تھے اِس تصور نے اُن کے پاکیزہ قلب پر ایک کیفیت طاری کر دی۔ عمامہ آنکھوں پر رکھ کر بے اختیار روئے اور یہ شعر پڑھا۔

خلت الدیار فسدت غیر مسود   ومن العناء تفردی بالسودد

یعنی ملک اہلِ کمال سے خالی ہو گیا اور میں جو شایانِ سرگروہی نہ تھا سرگروہ بنا۔ میرا سرگروہ یگانہ بننا کیسا اندوہ افزا ہے[3]۔ ادب عربی میں جو مرتبہ اصمعی کا ہے اُس سے ایک زمانہ واقف ہے باوجود کلام عرب کے دقائق سے واقف ہونے کے یہ امام ادب کلام اللہ اور حدیث کے معنی بیان کرنے سے بہت بچتا تھا۔ جب اس قسم کا سوال کیا جاتا تو اصمعی جواب دیتا کہ عرب اس لفظ کے یہ معنی لیتے ہیں مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ کتاب و سنت میں کون سے معنی مراد ہیں[4]۔ امام ادب ابو العباس ثعلب کے پاس ایک شخص آیا اور کسی علمی مسألہ کا جواب چاہا۔

---

[1] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۶۱۔ [2] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۸۔ [3] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۴۶۵ [4] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۲۸۹۔

ثعلب کو چونکہ وہ مسئالہ معلوم نہ تھا اس لئے جواب میں لا ادری کہہ دیا۔ وہ بیچارہ اس امید پر آیا تھا کہ اُن کے پاس مشکل حل ہو جائے گی۔ یہاں جو یہ صاف جواب سُنا تو بہت جھنجھلایا اور کہا کہ حضور کی یہ تو شہرت ہے کہ لوگ سفر کر کے حاضر ہوتے ہیں، اور علم کا یہ حال ہے کہ ایک ذرا سے سوال کے جواب میں لا ادری ارشاد ہوتا ہے۔ ثعلب نے ازراہ ظرافت کہا کہ میرے پاس جتنی لا ادریاں ہیں اگر تمھارے پاس اتنے اونٹ ہوتے تو تم بڑے مال دار ہو جاتے[۵۱]۔ متنبی مشہور شاعر کا واقعۂ قتل اس بات کی کہ اُن دنوں سچی بات دلوں پر کیا اثر کرتی تھی ایک بے نظیر مثال ہے۔ شاعر مذکور اپنے وطن کوفہ کو واپس آ رہا تھا۔ بغداد کے سواد میں پہنچا تو خوں خوار قزاقوں نے حملہ کیا۔ اوّل تو متنبی مع رفقا کے خوب لڑا مگر پھر جان بچا کر بھاگا۔ اُس کے دلیر غلام نے آقا کو بھاگتا دیکھ کر کہا کہ جس شخص کا یہ شعر ہو حیف ہے کہ لوگ اُس کی نسبت بھاگنے کا تذکرہ زبان پر لائیں ؎

فالخیلُ واللّیلُ والبیداءُ تعرِفُنی[۵۲] والحربُ والضربُ والقرطاسُ والقلمُ

متنبی یہ سُن کر میدان کی طرف لوٹ پڑا اور اتنا لڑا کہ اُسی جگہ کام آ گیا[۵۳]۔ ابو العلاء اور ابن اسحٰق دونوں فن ادب کے مشہور امام تھے۔ ایک بار نحو کے علم میں اُن میں باہم مناظرہ ہوا تھا۔ کسی موقع پر ابو العلاء نے یونس نحوی سے اس مناظرہ کا تذکرہ کیا تو صاف دلی سے اعتراف کیا کہ اُس مناظرے میں ابن ابی اسحٰق قاعدۂ ہمزہ میں مجھ پر غالب آ گئے تھے۔ اس فصل پر میں نے بعد کو غور کیا ہے[۵۴]۔ ابو زید انصاری سے کسی نے پوچھا کہ فلاں موقع پر تم مجزرق بولتے ہو اور ابو عمرو مجزرق صحیح کون سا لفظ ہے۔ ابو زید نے کہا کہ چونکہ ابو عمرو کی والدہ نبطی ہے اور یہ لُغت بھی نبطی ہے اس لیے ابو عمرو کا قول زیادہ مستند ہے[۵۵]۔ شعرا اپنی بد دماغی اور بے نیازی میں ضرب المثل

---

[۵۱] ابن۔ج ۱۔صفحہ ۳۰ ۔ [۵۲] گھوڑا رات جنگل۔ حرب وضرب اور کاغذ وقلم یہ سب مجھ کو خوب پہچانتے ہیں
[۵۳] ابن۔ج ۱۔صفحہ ۳۷ [۵۴] نزہۃ۔صفحہ ۲۳ [۵۵] نزہۃ صفحہ ۱۲۴

ہیں۔ اُن کی نازک مزاجی دوسروں کے کمال کے سامنے سر جھکانے کو گوارا نہیں کرتی۔
جس قرن کا ذکر ہم کر رہے ہیں اُس کے اثر نے شاعروں کو بھی اچھوتا نہیں چھوڑا تھا۔
ابوالعتاہیہ ایک دفعہ اپنے معاصر بشار سے ملنے گئے اور اثنائے کلام میں بشار سے کہا
کہ تمھارے یہ شعر اعتذار بکا میں مجھ کو نہایت پسند ہیں ؎

کم من صدیق لی اسا   رقه البکاء من الحیاء
واذا تفطن لا منی   فاقول مالی من بکاء
لکن ذهب لارتدی   فطرفت عینی بالرداء

بشار نے کہا کہ اس مضمون میں تقدم کا شرف آپ کو حاصل ہے اور میں کاسہ لیس ہوں۔
میرا شعر آپ ہی کی دریا کا قطرہ ہے۔ چنانچہ آپ نے کہا ہے ؎

فقالوا قد بکیت فقلت کلا   وهل تبکی من الجزع الجلید
ولکن قد اصاب سواد عینی   عوید قذی له طرف حدید
فقالوا ما لدمعهما سواء   اکلت مقلتیك اصاب عود[۱]

ایک روز مولانا شمس الدین رومی سے کسی نے کہا کہ شیخ ابن الوفا مولانا خسرو کے
پاس تو جاتے ہیں مگر آپ کے پاس نہیں آتے مولانا نے جواب دیا کہ حق بجانب شیخ کے
ہے۔ مولانا خسرو عالم باعمل ہیں اس لئے قابل زیارت ہیں میں اگرچہ علم پڑھا ہے مگر سلاطین
کی صحبت میں بیٹھتا ہوں اس لیے قابل زیارت نہیں رہا۔[۲]

---

[۱] ابن۔ ج ۱۔ ص ۷۳ . [۲] شق ج ۱۔ ص ۹۴

عنوانِ سوم

اختلاف و اتفاق

اِس عنوان کے قائم کرنے سے ہمارا مقصود یہ عیاں کرنا ہی کہ علمائے سلف کا اُن عالموں کے مقابلے میں کیا عمل رہا ہی جو اُن سے عقائد یا جزئیات مسائل میں مخالف تھے زیادہ صاف الفاظ میں یہ سمجھئے کہ علمائے اہل سُنت و جماعت کا سلوک دوسرے اہلِ قبلہ (مثلاً شیعہ و خارجی و مرجیہ و قدری) علما کے ساتھ کیسا تھا اور خود اہل سنت و جماعت کے مختلف فرقوں کے علما کس قسم کا برتاؤ باہم رکھتے تھے۔ آیا عقائد کا اختلاف ایسی حد فاصل خیال کیا جاتا تھا جو ایک کو دوسرے کی صورت سے بیزار، اُس کی خوبیوں کا منکر، اور اُس کے ارتباط کو ایمان میں خلل انداز سمجھنے والا بنا دیتا۔ یا آں کہ وہ دراوت عقیدہ کو برا سمجھ لینے کے بعد اُن کو ثقہ و صالح جانتے۔ اُن سے احادیث روایت کرتے اور اُن کے علم و فضل کے حاضر و غائب عقید تمند رہتے تھے۔ یہ بات سب کے نزدیک مُسلّم ہی کہ سچا اسلامی جوش اور خالص دینی حمیت قرون خیر پر ختم تھی۔ اور نبوت کے عہد پاک کے قرب کی وجہ سے جو آثار صلاح و رشاد ابتدائی صدیوں میں تھے وہ بعد کو باقی نہیں رہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اسی وجہ سے اُن بزرگوں کے طریقے اور مسلک کو عین صراط مستقیم اور ٹھیک راہ دین مانا جاتا ہی۔ پس ہمارا حال و خیال اگر سلف صالحین کے حال و خیال کے خلاف ہی تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہم راہ صواب سے دور جا پڑے ہیں۔ یہ بات طریقۂ حق سے بعید ہوگی کہ ہم اُن کی شیوے

کو اپنے مسلک کے مخالف دیکھ کر ازراہِ تعصب خلافِ حق سمجھیں اور اپنے ہی خیال باطل کو عین دین داری تصور کریں ہم نے اس باب میں یا تو تابعین و تبع تابعین کے اقوال و افعال کا حوالہ دیا ہے یا اُن علمائے مابعد کے اقوال و افعال کا جو بالاتفاق پیشوائے ملت مانے گئے ہیں اور مزید احتیاط یہ کی ہے کہ یہ حالات اور اقوال بھی صرف بحوالہ امام ذہبی نقل کئے ہیں جو فن رجال و اسانید کے مستند امام شمار کئے جاتے ہیں۔ ایک واقعہ بحوالہ کشف الاسرار البنہ نقل کیا ہے۔ اصل مبحث پر بحث کرنے سے پیشتر یہ دیکھنا مناسب ہوگا کہ اگلے علمائے ربانی مذہبی جھگڑوں اور دینی نزاعوں کو کیسا خیال فرماتے تھے۔ آیا اُن کو تمام اُصول دین و ارکان مذہب سے زیادہ مہتم بالشان اور لائق اہتمام سمجھتے تھے یا اُن کو نفرت کی نظر سے ملاحظہ فرماتے اور بربادی و تباہی کا ایک ذریعہ تصور کرتے تھے۔ ذیل کے اقوال صاف صاف ثابت کر دیں گے کہ وہ قدسی گروہ ہمیشہ اُن سے بیزار رہا۔ امام ششم حضرت جعفر صادق ارشاد فرماتے ہیں ایاکم والخصومۃ فی الدین فانھا تشغل القلب و تورث النفاق یعنی تم دین میں جھگڑا کرنے سے اس واسطے کہ وہ دل کو کام کی باتوں سے باز رکھتا ہے اور نفاق پیدا کر دیتا ہے۔ صدقت یا ابن رسول اللہ جس بات سے بارہ سو برس پیشتر امام روشن ضمیر نے مسلمانوں کو ڈرایا تھا۔ آج اُس کے دردناک نتیجے اہل دین کے سامنے ہیں۔ اگر اس مقولے پر عمل رہتا تو مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے شرمناک صفحے نہ لکھے جاتے۔ امام اعظم فرماتے ہیں کہ مجھ کو علم کلام میں عجیب ملکہ عطا فرمایا گیا تھا۔ اور ایک زمانہ دراز تک میرا یہی مشغلہ رہا۔ چونکہ شہر بصرہ اس قسم کے مباحثہ کرنے والوں کا مرکز تھا اس لئے میں بیس دفعہ سے زیادہ وہاں گیا اور کبھی ایک برس اور کبھی اس سے کم کبھی اس سے زائد وہاں مقیم رہا۔ معتزلہ اور خوارج وغیرہ کل فرقوں سے میرے مباحثے رہے اور الحمد للہ میں نے سب کو مغلوب کیا۔ بعض خاص فرقوں کا کونے

ہیں مجمع تھا اُن سے میں وہاں بحث کرتا اور غالب آتا۔ اس زمانے میں علم کلام کو میں سب علوم سے افضل و اعلیٰ سمجھتا تھا۔ جب میری عمر کا ایک حصّہ اس میں صرف ہو چکا تو میں نے ایک دفعہ دل میں کہا اور سوچا کہ صحابۂ کرام اور تابعین و تبع تابعین ہم سے زیادہ ان باتوں کو سمجھنے اور جاننے والے تھے اور حقائق امور کو ہم سے زیادہ پہچانتے تھے مگر انھوں نے کبھی ان باتوں میں جھگڑا اور خوض نہیں کیا بلکہ اس سے خود باز رہے اور دوسروں کو شدت کے ساتھ منع کیا۔ میں نے اُن کا غور و خوض شریعت کے معاملات اور فقہ کے مسائل میں پایا۔ اُنھیں میں وہ بحث کرتے تھے اور اسی کی ترغیب دیتے تھے۔ سلف کا دورِ اوّل اسی پر ختم ہو گیا۔ تابعین نے اسی خصلت کی پیروی کی۔ اِن بزرگوں کے اِن حالات کا انکشاف ہوتے ہی میں نے منازعت اور علم کلام میں غور و خوض کرنا چھوڑ دیا اور سلف صالحین کے طریقے کو اختیار کر کے وہی کام کرنے شروع کئے جو وہ کرتے تھے۔ اور ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگا۔ اس کے ساتھ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لوگ علم کلام کے مدعی ہیں اور اُس میں جھگڑتے ہیں اُن کی شان سلف کی شان کے اُن کا طریقہ کا سلف کے طریقے کے خلاف ہے۔ میں نے اُن کے قلوب میں قساوت اور دلوں میں شدت پائی وہ کتاب و سُنت اور سلف صالحین کی مخالفت کی پروا نہیں کرتے یہ دیکھ کر میں نے اُن کو چھوڑ دیا۔ اور اس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ انتہیٰ خلاصۃً (کشف جلد اوّل صفحہ ۹ و ۱۰) یہ دوسری صدی کے متأخر اور مناظرین کا حال تھا آج کل کے مناظرے اور مناظرہ کرنے والوں کے حال کا قیاس اسی پر فرمائیے۔ شام کے مقتدا امام اوزاعی کا (جو تبع تابعی ہیں) قول ہے کہ اذا اراد اللہ بقوم شراً فتح علیھم الجدل و منع عنھم العمل یعنی جب کسی قوم کی بربادی خدا تعالیٰ کو منظور ہوتی ہے تو اُن پر جھگڑے کے دروازے کھول دیتا ہے اور عمل سے باز رکھتا ہے۔

مطلب یہ کہ جب تم دیکھو کہ ایک قوم جھگڑنے میں بہت چست ہے اور عمل میں سُست تو سمجھ لو کہ خدا کی بھیجی ہوئی تباہی اُس پر آرہی ہے۔ ایک دوسرے تبع تابعی امام حجاج ابن ارطاۃ فرماتے ہیں کہ ما خاصمت قط ولا جلست الی قوم یختصمون یعنی میں نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا اور نہ کبھی ایسے لوگوں کی صحبت میں بیٹھا جو جھگڑالو ہوں۔ اس قول سے پتا لگتا ہے کہ امام حجاج کے نزدیک کسی شخص یا فرقے سے بیزار اور اُن کی مجالست سے متنفر کر دینے والی کیا صفت ہو سکتی ہے۔ آپ اگر اس مقولے کو آیندہ کے واقعات سے ملائیں گے تو ایک اہم نتیجہ حاصل ہوگا۔

ان اقوال کو پڑھ کر ایک خلجان طبیعت کو پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات واضح طور پر ثابت ہے کہ ائمۂ دین نے ہمیشہ طریقۂ باطل کی تردید اور راہ صواب کی تائید فرمائی ہے۔ اور اُن کے مناظرے معتزلہ وغیرہ فرقوں کے علما کے ساتھ تاریخ و فن کلام میں مذکور ہیں۔ پھر کیونکر مذہبی مباحثوں کو مورثِ نفاق اور باعثِ بربادی کہا جا سکتا ہے۔ اس شبہے میں ایک افسوسناک خلط مبحث ہے اور وہ یہ ہے کہ اختلاف و خصومت میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اور ہم علماے سلف کے اختلاف کو اپنی نزاعوں پر قیاس کرتے ہیں۔

حضرت یحییٰ ابن سعید جو اکابر تابعین میں ہیں کس خوبی سے اختلاف و نزاع کا امتیاز ظاہر فرماتے ہیں۔ اُنھوں نے فرمایا ہے کہ اهل العلم اهل توسعة وما برح المفتیون یختلفون فیحلّ هذا ویحرم هذا فلا یعیب هذا علی هذا یعنی علما اہل وسعت ہیں اور مفتی ہمیشہ باہم اختلاف کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ایک چیز کو حلال بتلاتا ہے دوسرا اُسی کو حرام کہتا ہے مگر یہ اُس کی عیب گیری نہیں کرتا اور وہ اس کی۔ اس مقولے میں جہاں تک کہ میری فہم ناقص میں آیا ہے ویحرم هذا تک اختلاف کی حد ہے اُس کے بعد جدل و

۵؎ تذ ج ۱ صفحہ ۱۲۴۔

خصومت کا بیان ہے۔ قول ہذا میں تین پہلو دکھلائے گئے ہیں۔ سب سے اوّل گروہ علما کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اُن کے خیالات وسیع ہوتے ہیں۔ اُس کے بعد یہ بتلایا ہے کہ اُن میں باہم اختلاف ہوتا رہا۔ اور پھر یہ جتایا ہے کہ اُن کا اختلاف باوجود اپنی سنگینی کے عیب گیری کی حد تک نہیں پہنچا۔ میں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ جو اختلاف کشادہ دلی کے ساتھ بے شائبۂ عیب گیری ہو وہ سلف صالحین کا طریقہ ہے اور اسی کو رحمت فرمایا ہے۔ اور جو بحث تنگ دلی اور عیب گیری کے پیرائے میں ہو وہ خصومت ہے اور اسی سے بچنے کی تاکید ائمۂ ہدیٰ نے فرمائی ہے۔ آج کل مسلمانوں میں جو مباحثے ہو رہے ہیں اُن کو اسی معیار کے بموجب پرکھنا چاہیے اور جس قسم میں وہ داخل ہوں اُسی کے احکام اُن پر جاری کیے جائیں۔ جزئیات مسائل کا اختلاف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے رسالۂ انصاف میں یہ اختلاف اور اُس کے اسباب کسی قدر بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں ہم اُس کی چند مثالیں جو طبقات الحفاظ میں نظر پڑیں یہاں درج کرتے ہیں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ آں حضرتؐ سے احادیث کم روایت کی جائیں۔ بعض صحابیوں کا مسلک اس کے خلاف تھا۔ اسی اختلاف کی وجہ سے خلیفۂ ثانی نے تین جلیل القدر صحابہ حضرت ابن مسعودؓ ابو درداء اور ابو مسعود کو نظر بند رکھا اور فرمایا کہ تم نے آں حضرت سے حدیثیں بہت روایت کر دیں[1]۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ خلیفۂ ثانی حضرت اُبیؓ کی بہت تکریم کرتے تھے اُن سے ضرورت کے وقت فتویٰ لیتے بلکہ اُن کی ہیبت مانتے۔ باوجود اس کے صحابی ممدوح کے ہمراہ ایک جماعت دیکھ کر ان کے مارنے کو درّہ اُٹھایا۔ حضرت اُبیؓ نے کہا دیکھو کیا کرتے ہو خدا تم پر رحم کرے۔ امیر المومنین نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ یہ

---

[1] تذ ج ۱ صفحہ ۷

جماعت سرگروہ کے لیے باعث فتنہ اور تابع کے واسطے موجب ذلت ہی[۵۱] حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت ابوذر کو فتوی دینے کی ممانعت کردی گئی تھی اس کے بعد وہ کئی برس زندہ رہے اور ۳۲ھ میں بمقام ربذہ انتقال فرمایا۔ رضی اللہ عنہ[۵۲]۔ کیا اس بیان کی حاجت ہی کہ صحابۂ کرام میں ان جزئی اختلافات کے ساتھ اتفاق کیسا تھا۔ تابعین کے زمانے میں اختلاف عقائد بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور معتزلہ اور قدریہ وغیرہ فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ اُس عہد میں بہت سے اسلامیہ فرقے ایسے موجود ہو گئے تھے جن کا اب نام نشان بھی نہیں اور صرف کتابوں میں ذکر رہ گیا ہی۔ اُس دورِ پاک میں مسلمانوں کے حوصلے بلند تھے اور جو کام وہ کرتے تھے اُس میں جوش وہمت کا پورا جلوہ ہوتا تھا۔ اِس لئے یہ تازہ وارد فرقے بھی اپنے عقائد کی اشاعت میں پوری کوشش وسعی سے کام لے رہے تھے۔ ہمارے علمائے کرام اِدھر تو ملت حقہ کی حفاظت وحمایت میں جان لڑا رہے تھے۔ اُدھر اُنھیں مخالف العقیدہ علما کی مرتبہ دانی اور حق شناسی میں نہایت کشادہ دلی سے مصروف تھے اُن کے حالات پڑھ کر اس کشادہ دلی کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی تین قسم کے دلائل سے ہم اپنے اس دعوی کو ثابت کرسکتے ہیں:

اوّلاً علمائے ممدوح نے اُن سے علم دین حاصل کیا اور اُن کو روایت حدیث کا اہل سمجھا۔ حضرت قتادہ کی جو جلالت شان حدیث میں ہی اُس سے کون واقف نہیں۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث اُن کے شاگرد ہوئے ہیں۔ عقیدۃً وہ قدری[۵۳] شدید تھے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں کہ باوجود اُن کے اس عقیدۂ ردی کے کسی نے اُن کی روایت کو مستند ماننے میں پس وپیش نہیں[۵۴] کیا۔ امام مغیرہ تابعی عثمانی تھے اور حضرت خلیفۂ چہارم پر گونہ معترض۔ تاہم شعبہ اور ابو عوانہ وغیرہ

---

[۵۱] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۷ و ۱۵۔ [۵۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۶۔ [۵۳] فرقہ قدریہ کا یہ عقیدہ ہی کہ بندہ اپنے افعال خیر و شر کا خالق وقادر ہی (الملل والنحل) [۵۴] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۱۰

جلیل الشان اماموں نے اُن سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں صاحب سنۃ اور احمد عجلی نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہے[۵۱]۔ عمرو ابن مُرّہ تابعی کی نسبت بیان کیا گیا ہے کہ وہ مرجیہ[۵۲] تھے۔ پھر بھی ایک جماعت نے اُن کی توثیق کی ہے[۵۳]۔ ہشام دستوائی قدری تھے۔ امام ابن سعد اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کان ثقۃ و حجۃ الا انہ یری القدر (یعنی وہ ثقہ اور حجت تو تھے مگر قدری تھے[۵۴]) سعید ابن عروبہ بھی فرقۂ قدریہ میں سے تھے۔ فن رجال کے دو مشہور عالی درجہ اماموں نے اُن کے ثقہ ہونے کی شہادت دی ہے یعنی حضرت یحییٰ ابن معین اور امام نسائی نے[۵۵]۔ حافظ ابونعیم فرماتے ہیں کہ میں نے آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا مگر حسن ابن صالح سے افضل کسی کو نہیں پایا۔ اُن کے عقیدے کی نسبت ذہبی فرماتے ہیں کان فیہ خارجیۃ یعنی اُن میں خارجیت تھی[۵۶]۔ امام ابوسہل واسطی شیعی تھے اور اسی جرم میں خلیفہ ہارون الرشید نے اُن کو قید کر دیا تھا۔ امام ذہبی اُن کے احوال میں تحریر کرتے ہیں متفق علی الاحتجاج بہ یعنی اُن کے حجت ہونے پر سب کو اتفاق ہے[۵۷]۔ محمد ابن فضیل کوفی بھی شیعی تھے۔ حضرت یحییٰ ابن معین نے اُن کی توثیق فرمائی ہے۔ اور امام احمد اُن کی نسبت فرماتے ہیں حسن الحدیث شیعی[۵۸]۔ حافظ حدیث ابومعمر قدری تھے۔ اس پر بھی امام بخاری نے اُن سے حدیث روایت کی ہے[۵۹]۔ عبداللہ ابن موسیٰ فرقۂ شیعہ کے علمائے کبار میں تھے اُن سے بھی امام بخاری نے روایت فرمائی ہے[۶۰]۔ ابن الاخرم امام شعرانی کے بارے میں فرماتے ہیں۔ صدوق غالٍ فی التشیع یعنی سچے ہیں اور تشیع میں غالی[۶۱]۔ شیخ الاسلام انصاری ایک جلیل القدر

---

[۵۱] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۲۸۔ [۵۲] فرقۂ مرجیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ایمان کی حالت میں کوئی معصیت مضر نہیں جیسے کفر میں طاعت مفید نہیں۔ (الملل والنحل) [۵۳] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۸ [۵۴] تذ ج ۱ صفحہ ۱۴۸ [۵۵] تذ ج ۱ صفحہ ۱۶۰ [۵۶] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۹۵ [۵۷] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۳۸ [۵۸] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۸۸۔ [۵۹] تذ۔ ج ۲ صفحہ ۷۷ [۶۰] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۳۲۴ [۶۱] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۰۲

امام حدیث کی نسبت اپنی رائے جن الفاظ میں ظاہر فرماتے ہیں وہ قابل شنید ہیں ثقۃ فی الحدیث رافضی خبیث[۵۱] یعنی حدیث میں ثقہ رافضی خبیث ہیں۔ حضرت یحییٰ ابن معین اس مرحلے کو انتہا تک پہنچاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ لو ارتد عبد الرزاق ما ترکنا حدیثہ یعنی اگر عبد الرزاق مرتد بھی ہو جائیں تو بھی ہم اُن کی روایت کردہ حدیث کو نہ چھوڑیں گے۔[۵۲] ان اقوال و افعال کا آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ علمائے مخالف العقیدہ خواہ قدری تھے خواہ خارجی، مرجیہ تھے یا شیعہ کبار علمائے شیعہ میں سے تھے، یا شیعہ غالی ورافضی خبیث مگر جب اُن کو ہمارے علمائے کرام نے ثقہ، حجت، صدوق، صاحب سنت اور اہل فضل پایا تو اُن کو ایسا ہی کہا اور ایسا ہی مانا اور اُن کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو آنکھوں سے لگایا اور دل میں رکھا۔ ہم تو حیرت میں ہیں کہ ایک شخص کو رافضی خبیث کہیں اور پھر ثقہ بتائیں۔ یہ ضدین کیونکر جمع ہوئیں۔ اور دوسرے شخص کو یہ فرض کرنے کے بعد بھی کہ وہ مرتد ہو جائے اس کی روایت کردہ احادیث کے ترک کرنے کو گوارا نہ فرمائیں، یہ مشرق و مغرب کا اجتماع کیسا۔ سچ یہ ہے کہ یہ معما چودھویں[۱۴] صدی میں حل ہونا بے حد دشوار ہے۔ اس کے حل کرنے والے وہی بزرگ تھے جن کی قوتِ ایمانی نے اُن کے قلوب کو تعصب سے پاک اور حق کا شیدا بنا دیا تھا۔ ثانیاً اُن کے فضل و کمال کی یہ تعظیم کی کہ حضرت عکرمہ (جن کا عقیدہ خوارج کی جانب مائل تھا) جب بصرے تشریف لے جاتے، تو حضرت خواجہ حسن بصری فتویٰ دینے اور درس تفسیر سے دست کشیدہ ہو جاتے اور جب تک اُن کا وہاں قیام رہتا خواجہ صاحب اسی برتاؤ کو قائم رکھتے[۵۳] ثالثاً علوم ظاہر سے گزر کر اُن کی روحانی عظمت کا اعتراف کیا۔ امام ابراہیم ابن طہمان (جن سے امام اعظم نے سماعت حدیث کی تھی) عقیدے کے مرجیہ شدید تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ امام احمد حنبل بوجہ

---

۵۱ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۲۴۷   ۵۲ تذ۔ ج ۳ صفحہ ۱۴۳   ۵۳ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۸۴

ضعف علالت تکئے کے سہارے سے بیٹھے تھے۔ اس اثنا میں کسی نے ابن طہمان کا تذکرہ چھیڑا۔ امام ربانی یہ سنتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ جس مجلس میں صلحا کا ذکر ہو اُس میں تکیہ لگا کر بیٹھنا روا نہیں[۵۱] خداوندا ایسے پاک مشرب بزرگ کیوں نہیں پیدا ہوتے!! منصور ابن زادان جلیل القدر تابعی تھے۔ امام ذہبی نے اُن کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے کان ثقۃ۔ حجۃ۔ صالحا کبیر الشان۔

جب حضرت خواجہ حسن بصری نے رحلت فرمائی تو تابعی ممدوح نے علی ابن زید سے (جو شیعہ تھے) فرمایا کہ تم حسن کی جگہ بیٹھو[۵۲] اس موقع پر اگر یہ غور سے دیکھا جائے کہ حضرت حسن بصری کی جگہ کیا جگہ تھی تو اس واقعے کی قوت انتہا کو پہنچتی ہے۔ اس بحث میں اب صرف ایک امر فیصلہ طلب باقی ہے۔ وہ یہ کہ آیا ان فرقوں میں عقیدے کی سختی اور شدت اُس عہد میں اسی حالت میں تھی جیسی آج ہے یا بجائے سختی کے اعتدال تھا۔ ضمنی طور پر اوپر کی بعض جرحوں کے الفاظ سے سختی کا پتہ لگتا ہے۔ لیکن ہم واقعات کی مدد سے بالتصریح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ شیعیت میں جو سخت سے سخت بدعت ہے وہ شتم صحابہ ہے۔ معاذ اللہ من ذالک دوسری صدی ہجری میں یہ ناسزا طریقہ اس فرقے میں رائج ہو گیا تھا اور عوام میں نہیں بلکہ خواص میں چنانچہ لکھا ہے کہ شیخ حدیث ابو الاحوص کا مکان جب محدثین سے بھر جاتا تو وہ اپنے بیٹے سے فرماتے کہ دیکھو ان میں جو شتم صحابہ کرتا ہو اُس کو نکال دو (وفات ابو الاحوص سنہ ۱۷۹ھ)[۵۳] اسی عہد میں قدریت بھی سنگین پیرایہ اختیار کر چکی تھی۔ امام ابو اسحٰق فزاری جب دمشق میں آئے تو ابو المسہر سے فرمایا کہ کہہ دو کہ جو قدری ہو ہماری محفل سے چلا جائے (وفات ابو اسحٰق سنہ ۱۸۵ھ)[۵۴] ان دو دونوں واقعوں سے معترضین کچھ نفع نہیں اُٹھا سکتے۔ اس لئے کہ جن بزرگوں کے اقوال حالات سے ہم نے استدلال کیا ہے اُن کے مقابلے میں امام ابو الاحوص و ابو اسحٰقؒ کی رائے فروغ نہیں پا سکتی۔

---

۵۱ تذ-ج ا-صفحہ ۱۹۲ ۵۲ تذ-ج ا-صفحہ ۱۲۶ ۵۳ تذ-ج ا-صفحہ ۲۲۷ ۵۴ تذ-ج ا-صفحہ ۲۴۸

اختلافِ عقائد کی صورت میں جب ہمارے علما نے اپنے مخالفین سے حسن سلوک پیش نظر رکھا تو ظاہر ہے کہ اختلافِ جزئیاتِ مسائل اُن کے مزاجوں پر کیا مؤثر ہو سکتا تھا اور اس لیے اس قسم کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہم تذکرۃً چند حالات گزارش کرتے ہیں۔ آج کل خود اہل سنت و جماعت کے مختلف فرقے باہم ایسا ہی اختلاف اور شدت کا برتاؤ کر رہے ہیں جیسا کہ وہ خلاف اہل سنت فرقوں کے ساتھ رکھتے ہیں۔ پس یہ چند مثالیں بھی خالی از نفع نہ ہوں گی۔ امام قدوری حنفی اور شیخ ابو حامد اسفرائنی شافعی کے مابین ہمیشہ مناظرہ رہتا تھا۔ مگر شیخ شافعی کا فضل و کمال امام حنفی کی نظروں میں سمایا ہوا تھا اور اس لئے وہ اُن کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔[۱] فقیہہ امام الدین شافعی اور قاضی القضاۃ ابو طالب زینبی حنفی آپس میں سخت مخالف تھے۔ شافعی فقیہہ کو پیام اجل قاضی القضاۃ سے پہلے آگیا۔ چونکہ ابو طالب کا ایک مخالف دنیا سے کم ہو گیا، اس لیے اُن کو بظاہر خوشی کا موقع تھا۔ لیکن جب زینبی اُن کے دفن سے فارغ ہوئے تو اُن کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر یہ حسرت ناک شعر پڑھا ؎

عقم النساء فلا تلدن شبیھه　　　ان النساء بمثله عقم

خواجہ حسن بصری اور امام ابن سیرین میں باہم کسی وجہ سے بدمزگی ہو گئی تھی۔ اسی بے لطفی کے سبب سے امام ابن سیرین خواجہ صاحب کے جنازے کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے۔ ایک روز کسی شخص نے آکر اُن سے بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک جانور مسجد کا سب سے زیادہ خوشنما سنگریزہ اُٹھا لے گیا۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ تیرا یہ خواب سچا ہے تو حسن بصری کی وفات قریب ہے۔ چنانچہ چند ہی روز کے بعد اُس سرگروہ اصفیا نے وفات پائی۔[۲] اس واقعے سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ باوجود اس قدر کشیدگی کے امام ابن سیرین نے خانۂ خدا کا نفیس سنگریزہ

---

[۱] ابن۔ج ۱ صفحہ ۲۰ [۲] ابن۔ج ۱۔ صفحہ ۱۳۹

خواجہ صاحب ہی کو بتایا اس بحث میں ہم ایک پُر مذاق قصہ نقل کرتے ہیں۔ اخفش امام نحو اور ابن رومی شاعر مشہور کے مابین چشمک ہو گئی تھی۔ ابن رومی بہت ضعیف الاعتقاد تھا! ور بدشگونی سے بہت ڈرتا تھا۔ اخفش کبھی کبھی اُس کے دروازے پر علی الصباح پہنچا اور کچھ نحس کلمے کہہ کر چلا آتا۔ ابن رومی پر اس کا اس قدر اثر پڑتا کہ اُس روز وہم کے مارے دن بھر گھر سے باہر نہ نکلتا جب تنگ آگیا تو اس نے بھی اپنا حربہ سنبھالا اور اخفش کی ہجو کہنی شروع کر دی ع

کہ شاعر چو رنجد بگوید ہجا

اخفش جو کلام فصیح پر شیدا تھا اپنی ہجو کے اشعار کو اُن کی خوبی اور روانی کی وجہ سے حفظ کر لیتا۔ اور مجالس املا میں جہاں اور اُستادوں کے شعر سند میں پیش کرتا وہاں اشعار بالا کو بھی موقع موقع سے سناتا جاتا اور فخر یہ کہتا چلو ابن رومی نے اس گمنام کو یاد تو کیا' اگرچہ ہجو کے ساتھ ہی سہی۔ بگڑے دل شاعر نے جو یہ قصہ سنا تو جل کر ہجو کہنی بھی چھوڑ دی [۵]

چھت کہ یہیتی زمانہ بہت دنوں تک مسلمانوں میں قایم رہ کر آخر آں جہانی ہو گیا۔ اور نزاعوں کے دروازے اُمت مرحومہ کے علما پر کھل گئے۔ پھر کیا تھا۔ قدری وجبری تو ایک طرف رہے خود اہل سُنت وجماعت کے ناجی فرقوں میں وہ جھگڑے ہوئے کہ کشت وخون تک نوبت پہنچی۔ بہت سے پیشوایان ملت نے خود سُنیوں کے ہاتھوں سے ایسی ایسی اذیتیں برداشت کیں جن کو سُن کر دل کانپ اُٹھتا ہے۔ امام زاہد شیخ الاسلام انصاری نے جو حنبلی تھے حنفیہ اور شافعیہ علما کے ہاتوں کیا کیا مصیبتیں نہیں اُٹھائیں۔ پانچ مرتبہ ننگی تلوار اُن کی گردن پر رکھی گئی وطن چھوڑ کر بلخ جانا پڑا۔ سلطان الپ ارسلان جب ہرات پہنچا تو مشائخ شہر ایک بہانے سے شیخ الاسلام کے خلوت خانے میں گئے اور اُن کے سجادے

---

[۵] ابن جلد ا صفحہ ۳۴۲

کے نیچے ایک تانبے کی مورت رکھدی اور سلطان سے مخبری کہ ابو اسمٰعیل مجسمیہ فرقے کے پیرو ہیں اور انھوں نے اپنی محراب میں ایک بُت رکھ چھوڑا ہے[۵۱] طرفہ ماجرا یہ ہے کہ شیخ الاسلام وہ بزرگ عالی درجہ ہیں جن کی شان و عظمت کا اہل ظاہر و باطن دونوں نے اعتراف کیا ہے۔ حافظ کبیر ابونعیم صاحب حلیہ جن کا نام آج تک ادب کے ساتھ لیا جاتا ہے اُن کی ایک زمانہ میں یہ حالت تھی کہ مذہبی مخالفت کی وجہ سے لوگوں نے اُن سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ اُس زمانے میں حنبلیوں اور اشاعرہ میں اس قدر تعصب بھرا ہوا تھا کہ روز فتنہ و فساد برپا رہتا تھا۔ ایک دن جب حافظ ابوبکر ابن علی کی مجلس املا ختم ہو گئی تو ایک شخص نے کہیں یہ کہدیا کہ جس کو ابونعیم کی مجلس درس میں چلنا ہو وہ اُٹھے۔ یہ کہنا تھا کہ اُس بے چارے کی شامت آ گئی۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور رسالے صحاح حدیث قلم تراش لے لے کر اُس مصیبت زدہ پر دوڑ پڑے۔ قریب تھا کہ وہ اُسی موقع پر قتل ہو جائے۔ خدا خدا کرکے اُس کی جان بچی[۵۲] ہم انھیں دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں اور اس سے زائد یہ قابلِ تاسف قصے بیان کرنا نہیں چاہتے۔ حیف یہ ہے کہ جب کبھی جو کچھ کیا گیا ہمیشہ اُس کا نام نصرتِ دین اور حمایتِ ملّت ہی رکھا گیا۔ اگر ہم اس باب کے اول و آخر واقعات کو ملائیں تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اتفاق و اختلاف کے لئے مذہب و عقائد کے ماورے بھی بہت سے اسباب ہیں۔ عنوان ہذا کو ہم ذیل کی نتیجہ خیز حکایت پر ختم کرتے ہیں۔ نحو کا امام یزیدی ایک روز امام ادب خلیل بصری سے ملنے گیا۔ خلیل اُس وقت ایک وسادہ (گدّے) پر متمکن تھے۔ یزیدی کو آتا دیکھ کر ایک طرف کو ہو بیٹھے اور وسادے کا ایک

---

[۵۱] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۳۷۶ و ۳۷۹

[۵۲] تذ ج ۳۔ صفحہ ۲۹۳ و ۲۹۴

حصہ خالی کر دیا۔ یزیدی نے بیٹھ کر کہا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ تکلیف سے بیٹھے ہیں۔ یہ سُن کر اُس ادیب بے نظیر نے یہ لاجواب جواب دیا ما ضاق موضع علیٰ اثنین متحابّین والدنیا لا تسع اثنین متباغضین یعنی دو دوستوں کے لئے کوئی جگہ تنگ نہیں اور دو دشمنوں کے لئے سارے جہاں میں بھی وسعت نہیں[۱]۔

---

[۱] ابن۔ ج ۴۔ صفحہ ۳۳۰

عنوانِ چہارم

حسنِ معاش

علماے سلف کی طالب علمی، حق پسندی اور حالاتِ اتفاق و اختلاف سے ہم بحث کر چکے اور جیسی کچھ بحث کی گئی آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ ایک نہایت ضروری پہلو پر ہنوز بحث باقی ہے وہ یہ کہ ہمارے علما نے دنیا میں کس طرح بسر کی اور اپنی معاش کو کس طور پر حاصل کیا۔ اُن کے صفات کی تکمیل ایک حد تک اس موضوع پر منحصر ہے۔ دنیا اور اُس کے معاملات اگر لغو ہوتے تو پانچوں وقت کی نمازوں میں دین کی بھلائی سے پہلے دنیا کی بھلائی کی دعا نہ مانگی جاتی اور فقہ کی کتابوں میں صرف عبادات کے ابواب ہوتے معاملات کے پیچیدہ مسائل کا ذکر نہ ہوتا۔ علما جب دنیا میں رہے اور دنیا کے تعلقات اُنھوں نے پیدا کیے، کسی انسان کے محکوم بنے کسی کے حاکم مختلف مشربِ خیال کے آدمیوں سے مِل جُل کر اس عالم میں رہے تو فطرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ان تعلقات کو کیسا نباہا۔ آیا سلیقے اور خوبی سے سب کے حقوق ادا کیے یا اُن کو تسامح اور بے پروائی کے نذر کر کے اُس کا دل خوش کن نام استغنا رکھا۔ ائمہ مجتہدین نے جو موشگافیاں مسائلِ معاملات میں کی ہیں اور جو آسان راہیں کاروبار کے متعلق نکالی ہیں وہ اس امر کی زبردست شہادت ہیں کہ وہ اعلیٰ درجے کے معاملہ فہم اور معاملاتِ دنیا پر غور فرمانے والے تھے۔ اس عنوان میں سب سے اول ہم یہ دیکھیں گے کہ علماے سلف نے اپنی معاش کن ذرائع سے پیدا کی اُس کے بعد یہ بحث

کریں گے کہ اُن کے تعلقات ملوک و رعایا کے ساتھ کیسے رہے۔ آخر میں اُن کے مختلف حالات ایسے لکھیں گے جن سے کسی نہ کسی پہلو سے اُن کی طرزِ معاشرت پر روشنی پڑے گی۔

کسبِ معاش

تجارت تجارت مسلمانوں کا مقدس پیشہ ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ سارے مسلمانوں میں افضل صحابۂ کرام تھے اور صحابہ میں مہاجرین کو فضیلت تھی اور مہاجرین میں قریش کا مرتبہ بڑھا ہوا تھا۔ قریش کا خاص پیشہ تجارت تھا جس کا ذکر کلامِ پاک میں جا بجا موجود ہے۔ علمائے سلف میں جن بزرگوں نے معاش قوتِ بازو سے حاصل کی اُن کا رجحانِ خاطر اکثر تجارت کی طرف رہا ہے چنانچہ ہم ذیل میں ایک جدول کے ذریعہ سے اُن علما کے نام نامی مع اُس مال کے جس کی وہ تجارت فرماتے تھے عرض کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے بڑے علمائے اُمت نے تجارت کے وسیلے سے کسبِ معاش فرمایا تھا۔

نمبر	اسمائے علما	مالِ تجارت	کیفیت
۱	حضرت سالم ابن عبداللہ		بازار میں لین دین کیا کرتے تھے (تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۷۷)
۲	ابو صالح سمان	روغن زیتون و روغن زرد	(تذ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۷۸)
۳	امام یونس ابن عبید	ریشمی پارچہ	(تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۱۳۰)
۴	داؤد ابن ابی ہند	•	(تذ جلد ۱ صفحہ ۱۳۱)
۵	امام ابو حنیفہ	ریشمی پارچہ	امام ممدوح کی صدر دوکان کوفے میں تھی اور اُن کے ایجنٹ جابجا ملک میں پھیلے ہوئے تھے جو مال خرید کر صدر کو بھیجتے تھے (تذ۔ جلد ۱ ص ۱۵۱)
	حضرت عبداللہ ابن مبارک		امام ذہبی اُن کا ذکر یوں شروع کرتے ہیں الامام التاجر السفار دوسرے موقع پر فرماتے ہیں افنی عمرہٗ حاجًّا و تاجرًا (تذ۔ جلد ۱ ص ۲۵)

نمبر	اسماے علما	مال تجارت	کیفیت
۷	وثیمہ	پارچہ ریشمی	(ابن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۷۱)
۸	حافظ الحدیث غندر بصری	چادر اور سوتی پارچہ	(تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۲۷۵)
۹	حافظ سعید الزراد حمیری	-	امام ذہبی فرماتے ہیں رحل بتجارۃ الی الشام (تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۳۴۴)
۱۰	امام القرا حمزہ زیات	زیتون، پنیر اور اخروٹ	کوفے سے روغن زیتون، حلوان کو لے جاتے وہاں سے پنیر اور اخروٹ لاکر کوفے میں بیچتے (ابن۔ جلد ۱ صفحہ ۱۶۷)
۱۱	حافظ الحدیث فضل کوفی	•	(تذ۔ جلد ۱ صفحہ ۳۴۱)
۱۲	حسن بن ربیع کوفی استاد امام بخاری	بوریے	اسی تجارت کی وجہ سے ان کا لقب بواری ہے (تذ۔ جلد ۲ ص ۴۴)
۱۳	امام ابوالحسن نیشاپوری	•	(تذ۔ جلد ۳۔ ص ۱۰۱)
۱۴	ہشام دستوائی	پارچہ	دستوا اہواز (عراق عرب) کا ایک پرگنہ تھا وہاں سے کپڑا لاکر فروخت فرماتے تھے اسی لئے دستوائی لقب پڑ گیا (تذ۔ جلد ۱ ص ۱۴۲)
۱۵	احمد ابن خالد قرطبی	جبّہ فروش	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۶)
۱۶	امام ابن جوزی	تانبا	ان کے گھرانے میں تانبے کی تجارت ہوتی تھی۔ آپ کبھی کبھی اپنے نام کے آگے صفار (ٹھٹیرا) لکھ دیتے (تذ۔ جلد ۴ ص ۱۳۷)
۱۷	حافظ الحدیث ابن رومیہ	ادویہ	اسی تجارت کے سبب سے ان کا لقب عشاب ہو گیا تھا۔ علم نباتات میں اپنے زمانے میں بے نظیر تھے (تذ۔ جلد ۴۔ ص ۲۱۷)
۱۸	ابو یعقوب لغوی	چوبی لٹھا	(ابن۔ ج ۱ ص ۳۱۵)
۱۹	محمد ابن سلیمان	گھوڑے	(تذ۔ ج ۳ ص ۱۰۸)

حرفت | جن علماے سلف نے اپنی معاش حرفت کے ذریعے سے حاصل کی اور ان کے نام

ہم کو معلوم ہو سکے اُن کے نام اور کام نیچے کے نقشے میں درج کئے جاتے ہیں۔

نمبر	اسمائے علما	نام حرفت	کیفیت
۱	ابو الفضل مہندس دمشقی طبیب مشہور	نجاری	اس فن میں وہ بہت ماہر تھے اور کثرت سے کام اُن کے پاس آتا۔ بیمارستان کبیر شاہی شفاخانہ کے اکثر دروازے اُن کے ہاتھ کے بنے تھے جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں (ساعات) اُنھوں نے درست کی تھیں اور اُن کی نگرانی کے متعلق اُن کو تنخواہ ملتی تھی (تذ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۰)
۲	ابن طاہر	کتابت	صحیحین اور ابو داؤد سات سات بار اور سنن ابن ماجہ دس بار اُجرت پر لکھی (تذ۔ جلد۔ ۳۔ صفحہ ۳۷۱)
۳	امام ابو الولید باجی	تار دیجنا	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۳۷۱)
۴	ابو سعید نحوی	کتابت	دس ورق روزانہ لکھتے تھے۔ یہ کام کر کے عدالت قضا میں اجلاس کرتے۔ اِنھیں اوراق کی اجرت پر بسر اوقات تھی (نزہۃ۔ صفحہ ۳۸۱)
۵	ابن الہثیم طبیب نامور	کتابت	تین کتابیں سال بھر میں لکھتے۔ مجسطی، متوسطات اور اقلیدس۔ ان کی قیمت ڈیڑھ سو اشرفی لیتے اور انھیں روپیوں پر بسر کرتے (عیون۔ جلد ۲۔ ص ۹۱)
۶	امام ابن النحاس	کتابت	(تذ۔ ج ۴۔ ص ۲۴)

ملازمت | ملازمت اس لحاظ سے کہ وہ انسانی آزادگی پر ایک ٹکس اور بھاری ٹکس لگانے والی ہے، اُن مزاجوں کو راس نہیں جو سارے عالم کے بکھیڑوں سے ایک علم کی خاطر آزاد اور بے تعلق رہنا پسند کرتے ہیں اور اس وجہ سے ابتداءً ہم کو اس سے مایوسی تھی کہ ہم اس حصۂ عنوان لہذا کو معمور کر سکیں گے۔ مگر واقعات نے ہماری مایوسی کو بدگمانی ثابت کیا اور حالات نے بتلایا کہ کہ علمائے سلف نے علمی شان کو قائم رکھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ دنیاوی عہدے حاصل کئے اور اُن کے فرائض قابلِ ستایش طریقے سے انجام دیئے ہیں۔ ہم ذیل میں چند علماء کے اسم گرامی درج کرتے ہیں جو عہدۂ جلیلہ وزارت تک ترقی کر کے پہنچے۔ اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ اس سے کم درجے کے عہدے بھی اُن کی ذات سے ممتاز رہے ہونگے۔

نمبر	اسماے علما	کس بادشاہ کے وزیر رہے	کیفیت
۱	امام ابوالفضل جعفر بن احمد بغدادی	ملک کافور والی مصر	امام دارقطنی نے اُن سے روایت کی اور حافظ شارح اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان من الحفاظ الثقاة ویروی فی حالة الوزارة (تذ۔ ج ۳۔ ص ۲۲۶ و ۲۲۷)
۲	قاضی علامہ ابن نظیر	•	(تذ۔ جلد ۳۔ صفحہ ۲۶۳)
۳	امام ابن حزم	خلیفہ مستظہر باللہ	(تذ جلد ۳ صفحہ ۳۲۴)
۴	امام لغت ونحو الحلیلی	مکتفی باللہ خلیفہ اندلس	(ابن۔ جلد ا۔ صفحہ ۱۲)
۵	کمال الدین فقیہ شافعی	نورالدین زنگی والی شام و مصر	قاضی ابن خلکان اُن کی نسبت کہتے ہیں کان عظیم الریاسة خبیرا بتدبیر الملک (ابن ج ا۔ ص ۴۷۲)
۶	مولانا تاج الدین ابراہیم پاشا رئیس الوزرا	سلطان بایزید یلدرم	(شق۔ ج ا۔ ص ۲۳۱)

تلاش سے اور بھی مثالیں مل سکتی ہیں مگر نمونے کے لئے اسی قدر شاید کافی ہونگی۔کم درجے کی ملازمتیں اختیار کرنے سے بھی علما کو احتراز نہیں رہا ہے۔چنانچہ لکھا ہے کہ قبیصہ خلیفہ عبدالملک کے مہردار تھے[۵۱] اور امام اسمعیل جو امام اوزاعی کے اُستاد ہیں خلیفہ منصور کے توشہ خانے (خزانۃ الثیاب) کے داروغہ[۵۲] اسی سلسلے میں ہم کچھ نظیریں ان علما کی پیش کرنا چاہتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ایک دربار کی جانب سے دوسرے دربار کو بطور سفیر تشریف لے گئے سب سے زیادہ قابل غور امام شعبی اور شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کی مثالیں ہیں۔اوّل الذکر میں یہ امر لائق لحاظ ہے کہ جس دربار کو سفارت لے گئے وہ غیر مسلم دربار تھا۔اور دوسرے میں تفرد و تجرید قابل ملاحظہ ہے جو سرگروہ سلسلہ سہروردیہ کو دنیاوی تعلقات اور علائق سے تھی۔یہ مثالیں بیّن ثبوت اس امر کا ہیں کہ علمائے کرام کو ہر حال میں مسلمانوں کے مصالح دینی کے ساتھ دنیاوی مصلحتوں پر نظر رہی ہے اور دونوں کو انھوں نے قابل توجہ خیال فرمایا ہے۔

نمبر	اسمائے علما	کس دربار کی جانب سے سفیر ہوئے	کس دربار میں گئے	کیفیت
۱	امام شعبی	خلیفہ عبدالملک اُموی	قیصر روم	قیصر کے دل پر ان کی دانشمندی کا بہت اثر ہوا اور اُس نے خلیفہ کو لکھا کہ مجھے تعجب ہے کہ ایسے شخص کے ہوتے مسلمانوں نے کیوں دوسرے شخص کو خلیفہ بنایا جب واپس آئے پر خلیفہ نے یہ فقرہ امام شعبی کو سنایا تو آپ نے کہا اور کیا خوب کہا کہ قیصر نے مجھکو تو دیکھا مگر آپ کو نہیں دیکھا آپ کو دیکھ لیتا تو ایسا نہ لکھتا (تذ-ج ا-ص ۷۴)
۲	شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی	دیوان عزیز یعنی دربار بغداد	دربار اربل	(ابن-ج ا-ص ۴۵۱)

۵۱ تذ-ج ا ص-۵۲- ۵۲ تذ-ج ا-ص-۲۳۰

نمبر	اسمائے علما	کس دربار کی طلب سے بھیجے گئے	کس دربار میں گئے	کیفیت
۳	حافظ ابن ماکولا	دیوان عزیز	طغاخان والی سمرقند	(تذ۔ جلد ۴۔ ص ۵)
۴	امام ابوالمحاسن قرشی	”	نورالدین زنگی	اس وقت ان کی عمر تیس برس کی تھی (تذ ج ۴ ص ۱۵۹)
۵	امام ابویعقوب شیرازی	”	متعدد دربار	(تذ۔ جلد ۴۔ ص ۱۵۰)
۶	محمد ابن سلامہ قضاعی	دربار مصر	دربار روم	حمیدی نے ان سے روایت کی ہے (ابن ج ۱ ص ۴۶۲)
۷	کمال الدین موصلی فقیہ	خلیفہ مقتفی باللہ	قلیج رسلان والی روم	(ابن جلد ۱۔ ص ۴۷۲)
۸	علامہ قوشجی شارح تجرید	مرزا الغ بیگ والی سمرقند	سلطان محمد خاں فاتح	ان دونوں سلطنتوں میں نزاع تھا اسی لئے یہ بھیجے گئے تھے ان کی حسن سعی سے صلح ہوگئی (دشق ج ۱ ص ۱۷۷)

تموّل اہل کمال کے لئے مالدار ہونا اُن کی خوبی میں داخل نہیں اور نہ اُس کے عدم یا وجود سے اُن کی عظمت کم یا زیادہ ہوسکتی ہے۔ بایں ہمہ متموّل ہونا اور باکمال ہونا یہ دونوں صفتیں باہم منافی بھی نہیں۔ حالات خاص نے اس کا مخالف پہلو ذہنوں میں راسخ کردیا ہے۔ اور اس پہلو کے ذہن نشین ہونے سے بجائے نفع کے قوم کو نقصان پہنچا ہے۔ ہم اس غلطی کو رفع کرنے کے لئے مختصر سے واقعات ایسے عرض کرنے کے درپے ہیں جو علمائے دین اور ائمہ مذہب کے تموّل کا ثبوت دیں ان میں سے بعض یہ بھی دکھلائیں گے کہ جو دولت سرمایۂ غفلت تصور کی گئی ہے وہی نیک در لائق ہاتھوں میں پہنچ کر کیسی خیر و برکت کا باعث ہوسکتی ہے۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسی ہزار اشرفیاں تھیں (آٹھ لاکھ روپئے) مگر کبھی اُن پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی (اس لئے کہ سال گزرنے سے پہلے کل آمدنی نیک کاموں میں صرف کردیتے تھے[1] امام وعلج بغدادی جو دارقطنی کے اُستاد ہیں اُن کی سرکار سے مکّہ مکرمہ

[1] الرحمۃ الغیثیہ صفحہ ۶

عراق اور سجستان کے علماے حدیث کے وظائف مقرر تھے۔ مکہ مکرمہ میں ایک مکان جس کا نام دارالعباس تھا اُنھوں نے تیس ہزار اشرفی کو خریدا تھا۔ جب اُنھوں نے وفات پائی تو معزالدولہ نے تین لاکھ اشرفیاں اُن کے ترکے میں سے لے لیں[۵۱]۔ امام ابوالہیثم کی نسبت لکھا ہی کہ بہت مال دار تھے۔ تین یا چار دفعہ اُنھوں نے اپنے ہم وزن چاندی خیرات کی تھی[۵۲]۔ حافظ ابن العربی کے تموّل اور فیاضی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہی کہ اشبیلیہ (واقع اندلس) کی شہرپناہ اُنھوں نے اپنی جیب خاص سے تعمیر کرائی تھی[۵۳]۔ حافظ رئیس ابن ابی ذیل ہروی کی سالانہ آمدنی اتنی تھی کہ عُشر کی بابت ایک ہزار خروار غلے کی سال بسال اُن کی سرکار میں آتی تھیں۔ امام ذہبی اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان کثیرالاموال[۵۴]۔ قاضی عیاض صاحب مشارق الانوار کو اپنے عہد میں اس قدر رفعت اور ریاست حاصل تھی کہ کبھی کسی کو اُن کے شہر میں نصیب نہیں ہوئی۔ امام موصوف فرماتے ہیں کہ جس قدر اُن کی رفعت بڑھی اُسی قدر اُن کی تواضع اور خوف الٰہی میں ترقی ہوتی گئی[۵۵]۔ شیخ ابوحامد اسفرائنی کی نسبت ابن خلکان اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں اِنتھت الیہ ریاسۃ الدنیا والدین ببغداد[۵۶]۔

علما کے تعلقات سلاطین کے ساتھ اور اُن کا اثر سلاطین پر

انقلاب زمانہ نے جو تہ بتہ پردے علماے سلف کے حالات پر ڈالے ہیں اُنھوں نے اُن کی بہت سی اعلیٰ اور مفید صفتیں نظروں سے چھپا دی ہیں جب اُن کے صفات کی اصلی تصویریں چھپ گئیں تو ذہنوں میں اُن کے غلط نقشے کھینچے اور جیسے وہ نہ تھے ویسے مانے گئے اور جب ان غلط نقشوں کی پیروی کی گئی تو قدم راہِ صواب سے دُور

---

[۵۱] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۹۸ [۵۲] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۲۳۶ [۵۳] تذ۔ ج ۴ صفحہ ۹۱ [۵۴] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۲۱۳
[۵۵] تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۰۰ [۵۶] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۹

جا پڑے اور مقصود فوت ہوگیا۔ علماے کرام کی نسبت گویا یہ مسلّمہ مسالہ ہو کہ اُن کو سلطنت و سلاطین سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ تعلق اُن کے لئے زیبا ہو۔ اسی خیال کا یہ اثر ہو کہ صدیوں سے علما اور سلاطین کو باہم محض ناآشنا اور بیگانہ پاتے ہیں۔ جن دقیق نگاہوں نے سوسئٹی کے حالات اور اُس کے باہمی تعلقات کی پوری پوری چھان بین کی ہے اُنھوں نے پتا لگایا ہو کہ مختلف تمدنی گروہ کسی نہ کسی قانونی سلسلے میں ضرور جکڑے ہوئے ہیں اور اپنی اپنی متناسب جگہ پر کسی نہ کسی اصول کے مطابق قائم ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ان سلسلوں میں سے کوئی سلسلہ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو نظامِ قومی درہم برہم ہو جائے گا۔ کوئی شبہ نہیں کہ جب علما کا قدم سلسلۂ انتظام سے نکل گیا تو جو کام اس عظیم الشان سلسلے میں اُن کے کرنے کے تھے وہ ابتر ہوگئے اور اس طرح حکومت و خلافت کی وہ ہیئت کذائی قائم نہ رہی جو اسلام نے کھینچی تھی۔ ہم نے جس تعلق کی نفی اوپر کی ہو اُس سے ہماری مراد وظیفہ خواری یا صلہ بخشی کا تعلق نہیں ہو بلکہ وہ تعلق مراد ہو جو ایک رکن انتظام کو اُس کے سرگروہ کے ساتھ ہوتا ہو۔ ہماری اس تمہید کو جو حضرات ملاحظہ فرمائیں وہ علما کا مفہوم ذرا عالی ذہن میں قرار دیں ورنہ ہمارے الفاظ بھٹی سے زیادہ رتبہ حاصل نہ کریں گے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ہر منصب اور ہر مرتبہ خاص خاص صفات چاہتا ہو اور جب تک انسان وہ صفات نہ پیدا کرے اُس منصب کے لائق نہیں ہو سکتا۔ جن علما کے سلسلۂ انتظام سے خارج ہو جانے کی وجہ سے ہم نے سلسلۂ حکومت کو ابتر قرار دیا ہو وہ علما وہ تھے جو مدبرانہ دل و دماغ رکھتے تھے اور معاملے کو معاملے کے پہلو سے سمجھنے والے تھے نہ کسی اور پہلو سے۔ ہم جو واقعات اس سلسلے میں پیش کریں گے وہ شاید اس بات کے ثابت کرنے میں قاصر نہ رہیں کہ علما نے جو سلطنتوں اور سلاطین سے تعلق رکھا تو وہ تعلق عامّہ مسلمین اور خود سلطنت کے حق میں کیسا مفید ہوا۔ اور کیسی دینی اور دنیاوی برکتیں

اُن سے مسلمانوں کو نہیں جو تعلق ایسا فائدہ مند اور نافع تھا وہ حقارت اور نفرت سے دیکھے جانے کے لائق نہ تھا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بہت سے علمائے کرام وقتاً فوقتاً یا ہمیشہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ایسے تعلقات کو عار بلکہ مضر تصور فرمایا ہے مگر ساتھ ہی اُس کے ہجری صدیوں کے اوائل میں کچھ نہ کچھ علمائے کرام ہمیشہ ایسے بھی موجود ہوتے تھے جو ان تعلقات کو اختیار فرماتے تھے اور اس طرح دینی و دنیاوی سلسلوں میں سدِ سکندری قائم نہیں ہونے پاتی تھی۔ امام اعظم نے عہدۂ قضا قبول نہیں فرمایا اور اس سختی سے انکار فرماتے رہے کہ دُرّے کھائے قید بھگتی انھیں کے شاگرد رشید امام ابو یوسف سارے قاضیوں کے سرگروہ بنے اور ہارون رشید کی مشہور خلافت کی خوبیوں میں ایک خوبی اُن کی ذات سے پیدا ہوئی ع

وللناس فیما یعشقون مذاھب

حضرت عمر ابن عبدالعزیز جن کی خلافت خلافت راشدہ مانی گئی ہے اور جن کے عہد حکومت نے عالم کو عدل و انصاف سے مالا مال کر دیا تھا اگر ایک امام تابعی کا قدم درمیان میں نہ ہوتا تو بظاہر اسباب دُنیا اُن کی حکومت کی نعمت سے محروم رہتی اور از سر نو عالم میں اسلامی تازہ روح نہ پھنکتی۔ جب سلیمان ابن عبدالملک خلیفہ دمشق کو شدتِ مرض نے مایوسی کے انداز دکھلائے اور رحلت کے قرب کی پیشین گوئی کی تو اُس کو اپنے جانشین کے تعین کی فکر ہوئی ایک کاغذ پر اُس نے ولی عہد کا نام لکھا اور مشورے کے لئے امام رجا[1] ابن حیات کے سامنے پیش کیا۔ امام ممدوح نے جو اُس کو پڑھا تو اُس میں خلیفہ کے ایک نابالغ بیٹے کا نام درج پایا۔ یہ دیکھ کر اُنھوں نے سلیمان سے فرمایا کہ خلیفہ کو اگر قبر

---

[1] تابعین کے چوتھے طبقے میں فن حدیث کے امام ہیں۔ مکحول نے اُن کو سید اہل شام بتایا ہے اور بعض نے شامیوں میں سب سے زیادہ فقیہ اُن کو مانا ہے (تذ۔ ج ۱۔ ص ۱۰۵)

میں آسودگی مطلوب ہے تو اپنا جانشین مردلائق مقرر کرنا چاہیئے۔خلیفہ کے دل میں اُن کا یہ کلام چُبھا اور اُس نے کہا کہ میں فکر و غور کر لوں۔ ایک یا دو دن کے توقف کے بعد اُس نے وہ کاغذ چاک کر ڈالا۔ اور امام ابن حیات کو بُلاکر پوچھا کہ میرے بیٹے داؤد کی نسبت تمھاری کیا رائے ہے۔ امام نے فرمایا کہ وہ قسطنطنیہ کی مہم پر یہاں سے صدہا میل دُور ہے اور نہ معلوم اس وقت زندہ بھی ہے یا نہیں خلیفہ۔ تو پھر میں کس کو ولی عہد مقرر کر لوں۔ امام جو امیرالمومنین کی رائے میں اس منصب کے قابل ہو۔ خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کی نسبت تمھارا کیا خیال ہے۔ امام میرے خیال میں وہ نیک، فاضل اور سلیم الطبع ہیں۔ خلیفہ تمھاری رائے درست ہے۔ وہ ایسے ہی ہیں اور میں اُنھیں کو ولی عہد کروں گا۔ یہ کہکر سند ولی عہدی حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے لئے لکھی اور اُس کو سربمہر کر دیا۔ اس کے بعد کوتوال شہر کو طلب کر کے حکم دیا کہ خاندانِ خلافت کے کل ارکان حاضر کئے جائیں۔ جب سب حاضر ہو لئے اور امام رجاء نے حسب ایماے خلیفہ اُس سربمہر کاغذ پر سب سے بیعت لی اور بعد بیعت اُن کو رخصت کر دیا۔ اس عہدنامہ کی تکمیل کے بعد اجل نے سلیمان کو زیادہ مہلت نہیں دی اور چند ہی ساعت کے بعد اُس کو ملک و مال سے جدا کر دیا۔ امام ابن حیات نے ایک معتمد ایوانِ خلافت کے دروازے پر بٹھا دیا کہ کسی کو اندر نہ جانے دے اور اس طرح وفات کی خبر کو شائع ہونے سے روک دیا۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر اُنھوں نے کوتوال کے ذریعہ سے پھر اہل بیتِ خلافت کو بُلایا اور دوبارہ اُس سربمہر فرمان پر بیعت لی۔ جب بیعت ہو چکی اور اُنھوں نے سمجھ لیا کہ اب کل کارروائی مستحکم ہے تو فرمایا کہ خلیفہ نے وفات پائی اور یہ کہکر کاغذ کھول کر سُنایا۔ جب ہشام ابن عبدالملک نے (جو دعویدار خلافت تھا) حضرت عمر ابنِ عبدالعزیز کا نام سُنا تو

کہنے لگا کہ قسم ہے رب کی ہم کبھی ان کی بیعت نہیں کرسکتے۔ امام رجاء نے کہا کہ بہتر ہے کہ کھڑے ہو اور آکر بیعت کرو ورنہ تلوار سے تمہارا ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ ہشام کو موقعے کا رنگ دیکھ کر چار ناچار بیعت کرنی پڑی۔ ہشام کی بیعت کے بعد امام رجاء نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کا بازو پکڑا اور منبر پر بٹھا دیا۔ منبر پر پہنچتے ہی اُن کی خلافت کا عملی دور شروع ہوگیا۔ اس واقعے سے امام رجاء ابن حیات کی قوت فیصلہ، حسن تدبیر اور استقلال طبیعت جیسا کچھ ظاہر ہوتا ہے الفاظ خود بتا رہے ہیں، ہمارے جتانے کی کچھ حاجت نہیں[1]۔ امام ابو یوسف کا جو اقتدار خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں رہا اُس سے ایک عالم واقف ہے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت لکھتے ہیں کہ ابو یوسف علم و حکمت اور ریاست و اقتدار میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ اُن کے زمانے میں اُن سے بڑھ کر کوئی دربار میں نہ تھا[2]۔ یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ مذہب حنفی کی اشاعت میں امام ابو یوسف کے اقتدار نے غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی۔ امام یحییٰ ابن یحییٰ مصمودی جو حضرت امام مالک کے شاگرد رشید اور موطا کے ناقل ہیں ملک اندلس کے امرا و سلاطین کے یہاں بہت محترم تھے۔ اسی اقتدار کے اثر سے امام مالک کا مذہب ملک اندلس میں پھیلا[3]۔ ایک اور امام وقت حضرت یحییٰ ابن اکثم دربار مامونی میں اول درجے کے ذی اثر رکن تھے۔ ابن خلکان اُن کی نسبت یہ الفاظ لکھتے ہیں۔ اُن کے علم و فضل، ریاست اور سیاست اور اُس تعلق سے جو اُن کو خلفا اور سلاطین کے ساتھ رہا زمانہ واقف ہے۔ مامون الرشید کے مزاج پر وہ اس قدر حاوی تھے کہ کسی کی وقعت اُن سے زیادہ خلیفہ کے دل میں نہ تھی۔ چوں کہ خلیفہ کو علوم میں کمال تھا اس لئے اُس نے اُن کے علم و عقل کے مرتبے کو کما حقہ سمجھا تھا۔ عہدۂ قاضی القضاتی پر وہ ممتاز تھے۔ تدبیر مملکت

---

[1] کامل ابن اثیر۔ ج ۵۔ صفحہ ۱۵ و ۱۶ [2] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۴۰۴ [3] ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۱۶

میں اُن کو اس قدر مداخلت حاصل تھی کہ وزرا کے احکام اُن کی رائے لینے کے بعد نافذ ہوتے تھے[۱]۔ سلطان شہاب الدین غوری کی (جس کا نام تاریخ ہندوستان میں آج تک روشن ہے) مدد آغازِ کار میں امام فخر الدین رازی نے اپنے مال و دولت سے فرمائی تھی۔ جب وہ بڑھ کر سُلطان ہوگیا تو یہ اُسکے دربار میں گئے اور شہاب الدین نہایت احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اسی طرح امام ممدوح دربار خوارزم میں موقر اور محترم تھے[۲]۔ امام زہری خلیفہ عبد الملک اور ہشام کے مقربین میں تھے[۳]۔ اور خطیب بغدادی عز الدولہ کے مقربوں میں داخل تھے[۴]۔ مولانا قونیوی کی نسبت لکھا ہے کہ سلطان روم کے حضور میں اُن کو نہایت ہی قدر و تمکین حاصل تھی اور برسوں تک وہ اسی شان سے مقبول بارگاہ سلطانی رہے[۵]۔ امام غزالی نے جب امیر المسلمین یوسف ابن تاشفین کی تعریف سُنی تو اُس سے ملنے کے لئے افریقہ کو روانہ ہوئے۔ امام ممدوح ہنوز منزل مقصود تک نہ پہنچے تھے کہ امیر موصوف کو اجل نے عالم آخرت میں پہنچا دیا۔ یہ خبر امام غزالی نے اسکندریہ میں سُنی اور وہیں سے واپس چلے آئے[۶]۔

ابن رافع قشیری حافظ حدیث اپنے مکان پر حدیث شریف پڑھایا کرتے تھے اور طلبہ کے علاوہ خراسان کے امیر نامور طاہر کی اولاد بھی مع خدم و حشم حاضر درس ہوتی۔ شیخ کے جلال کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کسی کو بات کرنے یا مسکرانے کی تاب و مجال نہ ہوتی[۷]۔ ملک عادل سلطان صلاح الدین کا بھائی بڑے دبدبے اور سطوت کا فرمان روا گزرا ہے۔ ایک مرتبہ محدث اسلام عبد الغنی دمشقی اُس سے ملنے گئے تھے۔ ملک عادل کا بیان ہے کہ جس وقت حافظ عبد الغنی میرے سامنے آئے تو مجھکو یہ معلوم ہوا کہ ایک شیر آگیا[۸]۔ امیر تیمور نے

---

[۱] ابن ج ۲۔ صفحہ ۲۱۷ [۲] ابن ج ۱ صفحہ ۴۰۵ [۳] ابن ج ۱ صفحہ ۴۵۱ [۴] تذ ج ۳ صفحہ ۳۳۴
[۵] العقد المنظوم صفحہ ۲۶۹ [۶] ابن ج ۲ صفحہ ۳۷۰ [۷] تذ ج ۲ صفحہ ۹۳ [۸] تذ ج ۴ صفحہ ۹

ایک روز اپنا ایک قاصد کسی ضروری کام پر روانہ کیا اور اُس کو عام اجازت دی کہ ضرورت کے وقت جس کا گھوڑا مل جائے اُس پر سوار ہو لے۔ قاصد کو چلتے چلتے ایک جگہ سواری کی حاجت ہوئی۔ اتفاقاً اسی موقع پر علامہ تفتازانی مصنف مطول خیمہ زن تھے اور خیمے کی پیش گاہ میں اُن کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے برید وہاں گیا اور جاتے ہی بے دھڑک ایک گھوڑا کھول لیا علامہ ممدوح اُس وقت اپنے خیمے کے اندر تھے۔ اس قصے کی اطلاع ہوئی تو نہایت برہم ہو کر اور قاصدِ سلطانی کو پٹوا کر نکلوا دیا۔ وہ جب لوٹ کر دربار میں پہنچا تو علامہ کی شکایت پیش کی۔ امیر تیمور کا جو حال یہ ماجرا سُن کر ہوا ہو گا آسانی سے قیاس میں آسکتا ہے! ہیجانِ غضب کے سبب سے تھوڑی دیر ساکت رہا۔ اُس کے بعد کہا کہ اگر شاہرخ یہ حرکت کرتا تو بے شک سزا پاتا مگر میں ایسے شخص کا کچھ نہیں کر سکتا جس کا قلم ہر شہر و دیار کو میری تلوار سے پیشتر فتح کر چکا تھا۔ عمرو صفار والی خراسان امام خفاف سے کہا کرتا تھا کہ حچا اگر میں کوئی کام آپ کی مرضی کے خلاف کروں تو آپ میری گردن اُڑا دیں[۵۱]۔ سلاطین عثمانیہ میں سلطان سلیم خاں بڑے جلال و ہیبت کا بادشاہ ہوا ہے۔ ایک روز اُس کو ملازمانِ خزانہ پر غصہ آگیا اور اُن میں سے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ مولانا علاء الدین جمالی ان دنوں قسطنطنیہ میں مفتی تھے اُنھوں نے جو یہ سخت حکم سُنا تو اُن بیکس ملازموں پر رحم آیا اور سُلطان کو سمجھانے کے لیے بابِ عالی کو تشریف لے گئے۔ قاعدہ یہ تھا کہ مفتی صدر بدون کسی حادثہ عظیم کے بابِ عالی کا قصد نہیں کرتا تھا۔ جب یہ ایوانِ وزراء میں داخل ہوئے تو سارے اہلِ دیوان حیران رہ گئے کہ خدا خیر کرے مفتی صاحب کیسے تشریف لائے۔ حضورِ سلطانی میں ان کی اطلاع ہوئی اور یہ اجازت ملی کہ تنہا آئیں۔ یہ وہاں پہنچے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کے بعد سلسلہ تقریر یوں

---

[۵۱] شق۔ ج ۱۔ ص ۹۵ [۵۲] تذ۔ ج ۲۔ صفحہ ۲۲۸

شروع کیا۔ جو علما منصب فتویٰ رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ سلطان وقت کی آخرت درست رکھنے کی فکر رکھیں۔ میں نے سنا ہے کہ سلطان نے ڈیڑھ سو آدمیوں کے قتل کا حکم دیا ہے حالانکہ شرعاً یہ تجویز نا جائز ہے لہذا میں عفو سلطانی کی استدعا کرتا ہوں۔ سلطان کو اپنے مفتی کی یہ مداخلت نہایت شاق اور ناگوار معلوم ہوئی اور قہر آلود ہو کر کہا کہ تم کو اپنی حد اختیار سے بڑھنا اور امور سلطنت میں دخل دینا نہیں چاہئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں معاملات سلطنت میں دخل نہیں دیتا بلکہ عاقبت سلطانی کی عافیت چاہتا ہوں اور میرا یہ فرض ہے ان عفوت[1] فلك النجاة والا فلك عقاب عظیم[2] سلطان کے دل پر اس کلام کی جلالت اثر کر گئی اور غصہ فرو ہو گیا۔ اور اُن تمام ملازموں کی خطائیں معاف کر دیں جب مفتی ممدوح نے اُٹھنے کا قصد کیا تو فرمایا کہ میں سلطان کی آخرت کے متعلق تو فرض منصبی ادا کر چکا اب ایک بات شان سلطنت کی نسبت کہنا چاہتا ہوں۔ سلطان نے پوچھا وہ کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ سب بیچارے آپ کے غلام ہیں کیا یہ مناسب ہوگا کہ غلام شاہی ہو کر دربدر مانگتے پھریں۔ سلطان نے فرمایا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا تو ان کی جگہ پھر انھیں کو عطا فرمائی جائے۔ سلطان نے ازراہ مراحم خسروانہ اس کو بھی قبول کیا مگر یہ کہا کہ ان کو قصور کی سزا ضرور دی جائیگی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس میں مجھ کو کچھ کلام نہیں ہے کیونکہ تعزیری سزا رائے سلطانی پر منحصر ہے۔ اتنا کہہ کر سلام کیا اور گھر کو چلے آئے۔[3]

ملک پر اثر

اس بیان میں شاید کسی تمہید کی حاجت نہیں ہے۔ علماء کی جو عظمت ہمیشہ مسلمانوں کے دل میں رہی ہے اُس کے کچھ نہ کچھ آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ علمائے سلف کو جو مقبولیت عامۂ خلق میں حاصل رہی ہے اور عموماً اہل ملک نے جس محبت

---

[1] اگر تم معاف کر دوگے تو نجات پاؤگے ورنہ سخت عذاب میں مبتلا ہو گے [2] [3] ش‌ق۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۲۴

اور ادب کی نظر سے اُن کو دیکھا ہی اُس کی کیفیت پڑھکر ایک قسم کا تحیّر پیدا ہوتا ہی۔ اگر صرف اُن کے ہم مسلک اور ہم مذہب اُن کی توقیر کرتے اور ان پر قربان ہوتے تو ہم یہ سمجھتے کہ مذہبی خیالات کا کرشمہ تھا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مخالف فرقے اور یہود و نصاریٰ اُن کی تعظیم و محبت میں ایسے ہی سرگرم اور محو تھے جیسے خود اُن کے ہم مشرب تو ہم کو یہ باور کرنا پڑتا ہی کہ محض مذہبی خیالات نہیں بلکہ علما کے اخلاق و صفات اُن کی عظمت کے اہم اور اصلی اسباب تھے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اس مقبولیت کو اُس فیاضیِ خیال اور وسعتِ نظر سے بہت ترقی ہوتی تھی جو عموماً ہم علمائے سلف میں پاتے ہیں اور یہ اُن کی فیاضی کسی طبقے اور فرقے کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ عموماً بندگانِ خدا کے واسطے عام اور شامل تھی۔

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید مع لشکر شہر رقّہ میں خیمہ زن تھا۔ اتفاقاً اسی موقع پر حضرت عبداللہ ابن مبارک امام حدیث کا گزر شہر مذکور میں ہوا۔ اُن کے استقبال کے لئے لوگوں کا یہ ہجوم ہوا کہ سارے اُفق پر غبار چھا گیا اور کش مکش میں آدمیوں کی جوتیاں پارہ پارہ ہو گئیں۔ حرم سرائے خلافت کے چوبی برج سے خلیفہ کی ایک کنیز نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہی۔ کسی نے کہا کہ خراسان کے عالم ابن مبارک تشریف لائے ہیں، اُن کے ملنے کے لئے مخلوق کا ہجوم ہو رہا ہی۔ شوخ مزاج کنیز نے بے ساختہ کہا کہ واللہ حکومت اس کو کہتے ہیں۔ ہارون کی کیا حکومت ہی جس کے لئے لوگ اہلکاروں کے زور اور دباؤ سے جمع ہوتے ہیں[1]۔ امام بخاری جب دربارِ علم سے کمال کا خلعت پہن کر اپنے وطن بخارا کو آئے تو بخاریوں نے نہایت جوش کے ساتھ اُن کے استقبال کا اہتمام کیا۔ شہر سے تین میل کے فاصلے پر خیمے ایستادہ کئے گئے اور تمام اہل بخارا اُن کی پیشوائی کے واسطے آئے یہاں تک کہ

---

[1] ابن۔ ج ۱۔ صفحہ ۲۴۰

کوئی قابل ذکر آدمی باقی نہیں رہا۔ شہر میں اُن کو اس شان سے لائے کہ روپیے اور اشرفیاں سر پر سے نثار کی جاتی تھیں۔ ہمارے علوم کا دوسرا مرکز شہر نیشاپور بھی امام ممدوح کی تعظیم میں اپنے ہمسر بخارا سے پیچھے نہیں رہا۔ امام مسلم فرماتے ہیں کہ جب امام بخاری کے تشریف لانے کی خبر نیشاپوریوں نے سنی تو بعض نے دو منزل اور بعض نے تین منزل آگے چل کر استقبال کیا اور شہر میں جس شان سے وہ داخل ہوئے وہ شان میں نے کسی حاکم یا عالم کی آمد میں نہیں دیکھی[1]۔ امام فیروزی جب ایک دینی کام کے لئے شہر بغداد سے چلے تو ایک جم غفیر نے اُن کی مشایعت کا قصد کیا۔ انھوں نے ہر چند منع کیا لیکن جوشِ عقیدت میں کسی نے ممانعت کا لحاظ نہیں کیا۔ ساوہ پہنچ کر جو ہمراہیوں کا اندازہ کیا گیا تو پچاس ہزار آدمی گننے میں آئے[3]۔

ایک مرتبہ شیخ ابو اسحٰق شیرازی خلیفۂ بغداد کی طرف سے ایک خدمت پر خراسان تشریف لے گئے تھے۔ جب وہ نیشاپور سے معاودت کرنے لگے تو پیشوائے خراسان امام الحرمین نے سوار ہونے وقت رکاب تھام لی۔ اس کا اثر تمام ملک خراسان میں یہ ہوا کہ شیخ ممدوح کے گھوڑے کے سموں کے نیچے کی مٹی بطور تبرک اُٹھائی اور آنکھوں سے لگائی گئی[4]۔ سفیان ابن عُیَینہ جب کوفے میں تشریف لائے اور امام اعظم نے اُن کے آنے کی خبر سنی تو شاگردوں سے فرمایا کہ تمہارے شہر میں عمرو ابن دینار کے علم کا حافظ آیا ہے۔ اس مختصر جملے نے سارے اہل کوفہ کے دل ابن عیینہ کی جانب مائل کر دیئے اور لوگ جوق جوق ابن دینار کی احادیث سننے کے لئے اُن کی خدمت میں آنے لگے۔ اُس وقت ابن عیینہ کی عمر بیس برس سے کم تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے مجھ کو اوّل محدّث بنایا وہ ابو حنیفہ ہیں[5]۔ علما کے ساتھ عامۂ خلائق کا یہ جوشِ عقیدت صرف اُن کی زندگی تک محدود نہ تھا اُن کے وفات فرما جانے

---

[1] مقدمہ صفحہ ۵۰۵ و ۵۰۱ [2] شہر بغداد کا ایک حصہ [3] تذ - ج ۲ - صفحہ ۲۰۶ [4] ابن - ج ۲ - صفحہ ۱۲۳ [5] ابن - ج ۱ - صفحہ ۲۱۱

کے بعد بھی قائم رہتا تھا۔ بلکہ بعد وفات اور زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ امام طاؤس تابعی کا جنازہ جب اٹھایا گیا تو آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ جنازہ کسی طرح نہ نکل سکا۔ آخر حاکم وقت نے فوج بھیجی اور اس کے اہتمام سے جنازہ نکلا۔ خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ حضرت عبداللہ ابن حسن (رضی اللہ عنہما) جنازے کو اٹھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی کشاکش سے ان کا لباس پارہ پارہ ہوگیا[1]۔ امام الحرمین نے جب وفات پائی تو تمام شہر نیشاپور کے بازار ماتم میں بند ہوگئے اور جامع مسجد میں جس منبر پر امام ممدوح خطبہ پڑھا کرتے تھے وہ توڑ دیا گیا[2]۔ اسی طرح جب امام ابو یعلی موصلی کا انتقال ہوا تو اکثر بازار شہر کے بند کر دیئے گئے[3]۔ امام ابو جعفر طبری کی قبر پر کئی مہینے تک شب و روز نماز جنازہ پڑھی گئی[4]۔ امام ابی داؤد کے جنازے کی نماز اسّی دفعہ ادا ہوئی کل نمازیوں کا تخمینہ کیا گیا تو تین لاکھ ہوا[5]۔

مخالف فرقوں کی محبت ہمارے علما کے ساتھ

امام ابوالعلاے ہمدانی سے خوارزم کے لوگ جو عموماً معتزلی تھے نہایت محبت رکھتے تھے حالانکہ امام ممدوح کو اپنے مذہب حنبلی میں نہایت شدت تھی[6]۔ بغداد کے اہل سنت و جماعت اور شیعہ میں ایک بار تنازع ہوا تو فریقین نے امام جوزی کو فیصلے کے لئے حکم قرار دیا۔ ایک زمانے میں دمشق کا حاکم جو شیعی تھا خطیب بغدادی سے برہم ہوگیا تھا۔ اس نے کوتوال شہر کو یہ ایما کر دیا کہ خطیب کسی حیلے سے قتل کر دیئے جائیں۔ امام ممدوح کو جب اس سازش کی خبر ہوئی تو انھوں نے شریف ابوالحسن کے مکان میں پناہ لی۔ جب کوتوال نے ان سے خطیب کو طلب کیا تو شریف موصوف نے فرمایا کہ خطیب کا قتل بالکل خلاف مصلحت ہے اگر وہ قتل

---

[1] ابن-ج ۱ صفحہ ۲۳۳ [2] ابن-ج ۱ صفحہ ۲۰۰ [3] تذ-ج ۲-صفحہ ۲۷۵ [4] تذ-ج ۲ صفحہ ۲۰۲

[5] تذ-ج ۱ صفحہ-۲۳۳ [6] تذ-ج ۱-صفحہ ۱۲۰ [7] ابن-ج ۱ صفحہ ۲۷۹

کئے گئے تو یاد رکھو کہ عراق کے شیعوں کی ایک جماعت ان کے ساتھ قتل ہو جائے گی۔[۱]

غیر مذہب کے لوگوں کی محبت علماء کے ساتھ

عباد ابن عوام ناقل ہیں کہ جب امام منصور تابعی کا جنازہ اُٹھایا گیا تو میں حاضر تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصاریٰ اپنے اپنے گروہ جدا جدا قائم کئے ہوئے جنازے کے ساتھ ساتھ تھے۔[۲] امام ابو العلاء کبھی کبھی (ہمدان سے) اپنے وطن کو جمعہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ جب وہ تشریف لے جاتے تو اہل شہر اُن کی مشایعت کے لئے شہر سے باہر کھڑے ہو جاتے۔ ایک جماعت مسلمانوں کی ہوتی اور ایک گروہ یہودیوں کا۔ جب اُن کو دیکھتے تو دونوں فریق دعا دیتے۔[۳] ابو الفتح کمال الدین شافعی کے پاس یہود اور نصاریٰ توراۃ اور انجیل پڑھنے آیا کرتے تھے۔ فقیہ ممدوح نے اُن کے ماننے والوں کی خاطر ان دونوں کتابوں کی شرح لکھی تھی۔[۴] امین الدولہ ابن تلمیذ بغداد کے مشہور عیسائی طبیب کا مکان شہرۂ روزگار مدرسہ نظامیہ کے پڑوس میں تھا جب کوئی طالب علم مدرسہ مذکور کا بیمار ہوتا تو یہ نیک دل طبیب اُس کو اپنے مکان پر لے آتا۔ اُس کا علاج کرتا اور ہر قسم کی آسائش کی خبر رکھتا اور بعد صحت پھر مدرسے میں پہنچا دیتا طبیب موصوف کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب نفس اور شرافت خصلت میں وہ بے نظیر تھا جب اُس نے وفات پائی تو (ابن خلکان کہتے ہیں) کہ شہر بغداد کے دونوں حصوں میں کوئی قابل ذکر شخص ایسا نہ تھا جو اُس کے جنازے کے ساتھ گریہ میں نہ آیا ہو۔[۵]

۱؎ تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۳۷ ۲؎ تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۱۲۷ ۳؎ تذ۔ ج ۴۔ صفحہ ۱۲۰

۴؎ ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۳۴ ۵؎ ابن۔ ج ۲۔ صفحہ ۱۹۳

علما کی معاشرت کے متعلق بعض اور حالات

اُن کا لباس

عرب کا ایک مشہور مقولہ ہے الناس باللباس علمائے کرام جو باطنی خوبیوں سے آراستہ تھے اُن کے حالات شاہد ہیں کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی کی جانب سے بھی اُن کو بے توجہی نہ تھی۔ سطرف بن عبداللہ پوشاک فاخرہ استعمال کرتے تھے[1] امام دارالہجرت حضرت مالک لباس نہایت پاکیزہ اور قیمتی پہنتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں نے اپنے شہر (مدینہ طیبہ) کے جتنے فقہا دیکھے سب کو خوش پوشاک دیکھا امام ممدوح جس مکان میں نشست فرماتے تھے وہ نہایت پاک صاف رہتا تھا۔ اُس میں چاروں طرف مسندیں بچھی رہتی تھیں اور ہر مسند پر جُدا جدا تکیے مہیا رہتے۔ اُن کی مجلس کا یہ داب تھا کہ کوئی بلند آواز سے بات نہ کرتا[2]۔ امام ابوحنیفہ بھی بہت خوش لباس تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک اُن کی نسبت فرماتے ہیں کان حسن الوجہ حسن الثیاب[3] ایک مرتبہ اُن کی ایک چادر کا تخمینہ کیا گیا تو تیس اشرفی ہوا۔ اور ایک دوسرے موقع پر اُن کے پیراہن اور چادر کا اندازہ کیا گیا تو چار سو درہم ہوا۔ حماد اُن کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ میرے والد اس قدر خوشبو کا استعمال کرتے تھے کہ جب وہ کہیں جاتے تو لوگ خوشبو کی وجہ سے پہلے ہی سمجھ جاتے کہ امام اعظم آرہے ہیں[4]۔ شیخ الاسلام جعفی پاکیزہ لباس پہنتے[5]۔ شیخ الاسلام ہروی جن کا زہد مشہور ہے جب باہر تشریف لاتے تو لباس فاخرہ اُن کے جسم پر ہوتا اور بیش قیمت گھوڑا اُن کے نیچے اور فرمایا کرتے تھے کہ افعل ھذا اعزازاً للدین یعنی میں یہ اظہارِ حشمت دین کے معزز کرنے کے واسطے

---

[1] تذ۔ ج ا صفحہ ۵۶ [2] تذ۔ ج ا صفحہ ۱۹۱ [3] صورت اور لباس دونوں پاکیزہ تھے
[4] خیرات حسان صفحہ ۲۲ و ۶۱ [5] تذ۔ ج ا۔ صفحہ ۳۴۰

کرتا ہوں[1]۔

جسمانی ریاضت ہم نے اس تحریر میں بعض عنوان ایسے قائم کئے ہیں جو نظر بحالات موجودہ علمائے کرام کے ذکر میں اجنبی بلکہ بے محل معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں میں سے غالباً یہ سرخی بھی ہے۔ ہمارے قدیم مدارس میں جسمانی ریاضت کا نزول تیا نہیں ہے۔ مدارس جدیدہ تعلیم علوم کے برابر اس کو بھی مہتم بالشان خیال کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں کے دو مختلف اثر پیدا ہوئے ہیں۔ نئی روشنی کے لوگ تو اس کو ترقی جدید کا ایک جلوہ سمجھ رہے ہیں۔ پرانے فیشن کے بزرگ اس کو داخل لہو ولعب اور ثاقت و متانت کے خلاف تصور فرماتے ہیں۔ تاریخی عدالت سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ دونوں خیال واقعیت سے دور ہیں۔ اہل علم میں جسمانی ریاضت کا اہتمام نہ تہذیب جدید کا نتیجہ ہے اور نہ خلاف متانت و وقار ہے۔ صدہا برس گزرے جب بھی ہمارے علماء مردانہ ورزشوں کے پابند تھے اور جو لوگ پیشوائے اُمت مانے گئے ہیں انھوں نے اس کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے۔ لہذا اس طریقے کو نہ جدید کہہ سکتے ہیں نہ خلاف شانِ علما۔ علماء کے حالات ایک طرف، تیراندازی اور گھوڑے کی سواری کی مشق کی تاکید حضرت سرور کائنات صلعم نے فرمائی ہے اور صحیح بخاری میں اُس گھوڑ دوڑ کا ذکر ہے جس کا اہتمام آپ نے بہ نفسِ نفیس فرمایا تھا اور جس میں عبداللہ ابن عمر بھی ایک گھوڑے پر سوار تھے اور اُس اونٹوں کی دوڑ کا مذکور ہے جس میں آں حضرت کی سواری کی اونٹنی دوڑی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی ریاضت ہمارے اہل علم کا خاص شعار ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے کی تحریر کے لئے جو کتابیں میں نے دیکھیں اُن سے ثابت ہوا کہ علمائے سلف کی عمریں عموماً بڑی ہوئی ہیں اور

---

[1] تذ۔ ج ۳۔ صفحہ ۳۸۱

اخیر عمر تک اُن کے قویٰ کام دیتے رہے ہیں[1]۔ یہ حقیقۃً اُسی ریاضت کا کرشمہ تھا جس کے وہ عادی تھے۔ ورنہ اس زمانے کی طرح ضعفِ دماغ اور جسمانی کمزوری اُس زمانے کے علما کی بھی خاص علامت قرار پاتی۔

امام ابن عون تابعی کے حالات میں لکھا ہے کہ اُن کو گھوڑے کی سواری کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے گورخر میدان میں گھیر کر مارا تھا[2]۔ گورخر کی چالاکی مشہور ہے اُس کو میدان میں گھیرنا اور تلوار، نیزہ یا تیر سے شکار کرنا بہت دشوار ہے۔ اس واقعے سے امام ممدوح کے اعلیٰ درجہ کی شہسواری اور فنونِ شکار سے پوری واقفیت کا نشان ملتا ہے۔ امام شافعی نے تیر اندازی میں وہ ملکہ حاصل کیا تھا کہ قریش میں اُن کا ثانی نہ تھا اور یہ کمال بہم پہنچایا تھا کہ اُن کے دس تیر دس نشانے اُڑا دیتے تھے[3]۔ امام بخاری کو بھی تیر اندازی کا خاص شوق تھا اور اکثر گھوڑے پر سوار ہو کر شہر سے باہر اُس کی مشق کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اُن کا ہات بھی ایسا سچا ہو گیا تھا کہ کم تیر خطا جاتے[4]۔ علامہ ابوالقاسم شافعی کی نسبت ابن خلکان لکھتے ہیں

کان علامۃ فی الفقہ والتفسیر والحدیث والاصول والادب والشعر وعلم التصوف جمع بین الشریعۃ والحقیقۃ۔ جو لوگ ابن خلکان کی پُر احتیاط روش تحریر سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مورخ مذکور نے یہ الفاظ محض گرمیِ سخن اور آرایش بیان کے واسطے نہیں لکھے ہوں گے بلکہ واقعات نے یہ الفاظ اُن کے قلم سے لکھوائے ہوں گے ہم کو اس موقع پر یہ بیان کرنا ہے کہ علامہ ممدوح کو اتنے علوم میں کمال پیدا کرنے کے ولولے میں بھی جسمانی ورزش اور فنونِ ریاضت کی طرف سے بے توجہی نہیں ہوئی اور اُن مشاغل عالیہ

---

[1] علامہ عینی نے ہدایہ کی شرح بنایہ جب لکھی تو اُن کا سن نوّے برس سے تجاوز کر چکا تھا۔ کتاب کے خاتمہ میں انھوں نے اس امر کی تشریح کی ہے اور فرمایا ہے کہ اس شرح کے لکھنے کا اتفاق اکثر شب کو ہوا

[2] تذ۔ ج ۱ صفحہ ۱۴۰ [3] تذ۔ ج ۱۔ صفحہ ۳۳۱ [4] مقدمہ صفحہ ۵۶۶

کے ساتھ ساتھ انھوں نے گھوڑے کی سواری اور مردانہ فنون میں وہ مشق بہم پہنچائی کہ اُن کی چابک سواری اور استعمال اسلحہ کی مہارت مرتبۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔[1]

اپنا کام خود کرنا جو لوگ اپنا کام خود کرتے ہیں اُن کو اپنی ذات پر بھروسا اور اعتماد ہوتا ہے اور اسی اعتماد نے دنیا میں بڑے بڑے کرشمے دکھلائے ہیں۔ جو لوگ اپنا کام خود نہیں کرتے اُن کے دل میں ایک قسم کی بزدلی پیدا ہوتی ہے اور یہ بزدلی انسانی حوصلے اور عزم کا بالکل ستیاناس کر دیتی ہے۔ حضرت سرور کائنات کے حالات مبارک میں لکھا ہے کہ حضور اپنا کام خود دستِ مبارک سے فرمایا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ آپ دوہ لیتے۔ پھٹا کپڑا خود سی لیتے۔ نعلین مبارک ٹوٹ جاتیں تو اُن کو اپنے ہی ہات سے گانٹھ لیتے۔ غرض اپنے کام کے لئے دوسروں کو کم تکلیف دیتے۔ آپ کے خادم حضرت انس فرماتے ہیں کہ دس برس میں آپ کی خدمت میں رہا اس عرصہ میں میں نے آپ کی خدمت اس قدر نہیں کی جتنے آپ نے میرے کام فرما دیئے۔ علمائے سلف کے حالات شاہد ہیں کہ انھوں نے اپنے پیشوائے ملت (روحی فداہ) سے یہ سبق بھی حاصل کیا تھا اور جو قویٰ خداوند تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائے تھے اُن کا پورا شکر بجا لاتے تھے۔ امام ابن طاہر جب فن حدیث کی تحصیل کے لئے امام حبال کی خدمت میں حاضر ہونے چلے تو لوگوں نے اُن کو جتایا کہ امام موصوف بازار سے اپنا کام خود کر لاتے ہیں وہاں بھی اُن کو تلاش کر لینا۔ چنانچہ جیسا یہ اُن کے شہر میں وارد ہوئے تو اول بازاروں میں گشت لگایا۔ تلاش کرتے کرتے اُن کو امام حبال ایک عطار کی دکان پر اس ہیئت سے ملے کہ دامن میں وہ تمام ضرورت کی چیزیں بھری ہوئی تھیں جو بازار سے خرید کر لائے تھے۔ اس واقعے کی قدر اُس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ امام ممدوح کی عمر اُس زمانے میں اناسی برس کی تھی۔[2]

---

[1] ابن۔ ج ۱ صفحہ ۳۰۰ [2] تذ۔ ج ۳ صفحہ ۳۸۵

ابوالاسود دؤلی واضع فن نحو پر اخیر عمر میں فالج گرا تھا اور اس کے اثر سے اُن کے ہات پاؤں مئوف ہوگئے تھے۔ اس معذوری کی حالت میں بھی وہ ہر روز پاؤں گھسیٹتے ہوئے بازار کو جاتے اور اپنا کام کرلاتے۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ضرورت اُن کو اس تکلیف کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ کیوں کہ ابوالاسود بہت آسودہ تھے اور بہت سے خادم اُن کی سرکار میں حاضر رہتے۔ ایک روز کسی نے اُن سے ازراہ تعجب دریافت کیا کہ اس قدر خادموں کے ہوتے ہوئے یہ شاقہ مصیبت ہر روز کیوں برداشت کی جاتی ہے۔ اُس دیبنے یہ بے مثل جواب دیا کہ بات یہ ہے کہ اس آمد و شد میں اتنا نفع ہے کہ جب میں گھر میں لوٹ کر آتا ہوں تو لڑکے بھی کہتے ہیں کہ آگئے لونڈیاں بھی کہتی ہیں کہ آگئے۔ اگر گھر میں پاشکستہ ہوکر پڑ رہوں تو بکریاں مجھ پر پیشاب بھی کریں تو بھی کوئی خبر نہ ہو۔[1] یہ مقولہ عجیب حکمت انگیز ہے اور شخصی حالت سے لے کر قومی حالت تک یکساں مؤثر ہے۔ دنیا میں جو کچھ گرمی ہنگامہ ہے وہ سب حرکت کا نتیجہ ہے اور سکون ملکوں اور قوموں کی رونق کو درہم برہم کرنے والا ہے۔ جو قومیں ہات پاؤں چھوڑ بیٹھی ہیں وہ پامالی کے سوا اور کس چیز کی توقع اس عالم میں رکھتی ہیں۔ امام بخاری نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی۔ اُس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے اُن میں خود امام بخاری بھی شامل تھے۔ یہ امام ربّانی اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لے جاتے اور راجوں کو دیتے۔ ایک شاگرد نے ازراہ دل سوزی ایک روز عرض کی کہ آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت ہے۔ امام ممدوح نے فرمایا کہ ھٰذا الذی[2] ینفعنی۔ نفعنا اللہ تعالیٰ باتباع السلف الصٰلحین و اٰخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین[3]

---

[1] ابن خ ج ا صفحہ ۲۴۱ [2] یہ وہ کام ہے جو مجھکو نفع دیگا [3] مقدمہ صفحہ ۵۶۷

نواب صدر یار جنگ بہادر کی تصانیف

ذکر حبیب | یہ رسالہ حضور آقائے نامدار صلعم کے حالات میں معتبر و مستند ہے اور مجالس میں پڑھنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔ قیمت ۱/

ذکر جمیل | یہ کتاب حضور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے حالات میں ہے اور درحقیقت آپ کی مقدس زندگی و پاکیزہ اخلاق کا مرقع ہے جس کے پڑھنے سے قلب پر خاص اثر پڑتا ہے۔ یہ معتبر رسالہ اس قابل ہے کہ محافل و مجالسِ میلاد شریف میں پڑھا جائے۔ زبان کی لطافت و شیرینی اور بیان کا حسن ادب قابل داد ہے ... قیمت ۲/

سیرۃ الصدیق | حضرت خلیفۂ اوّل کے پاک حالات نہایت اعلیٰ درجہ کے چھپے ہوئے حجم تقریباً پونے دو سو صفحے قیمت ۱۰/

ذکرِ محبوب | یعنی وہ بیان جو نواب صدر یار جنگ بہادر نے گیارہویں شریف کی تقریب میں ٹولی مسجد حیدرآباد (دکن) میں بتاریخ ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۴۲ھ کیا جس میں حضرت پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر رضی اللہ عنہ کے پاکیزہ حالات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں ... قیمت ۲/

نقشِ وفا | حقوق و فرائض زوجین کے متعلق نہایت بیش بہا نصائح و مفید ہدایات دستور العمل بنانے کے قابل ہیں۔ نوشتہ جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی حسرت و جناب نفیس دلہن صاحبہ زید دامہ ... قیمت ۸/

ملنے کا پتہ محمد مستقیم علی خان شروانی علی گڑھ

علمائے سلف ہماری قومی زبان اردو کے مشہور مصنف مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی نہایت مقبول تصنیف (جو عربی کی مستند ترین تاریخی کتابوں کے تقریباً چھ ہزار (۶۰۰۰) صفحات کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے) اس کتاب سے ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر علم کا کس قدر ذوق تھا اور مسلمان علماء کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی کی کیا کیفیت تھی مختصر یہ ہے کہ ایسی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ کتاب کی خوبی صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بیان اور زبان کی پاکیزگی و شستگی کے ساتھ لکھائی چھپائی بھی نہایت دیدہ زیب ہے قیمت ۱

نابینا علماء علمائے سلف کے سلسلہ میں یہ رسالہ اُن مسلمان علماء کے حالات میں ہے جنھوں نے سر کی آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود علم کے نور سے نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے دل و دماغ کو منور کیا۔ دنیا کی ہر زبان میں ایسے رسالے بہت کم ہیں۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلا اور اب تک واحد رسالہ ہے۔ قیمت ۲

مجنون لیلیٰ خمسۂ خسروی کی تیسری مثنوی قیس عامری کے عشق کا مشہور عالم فسانہ جس میں سوز و گداز اور درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ بہ تصحیح و تنقید جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور امور مذہبی ریاست حیدرآباد دکن۔۔ قیمت [illegible]

سرسید کی یاد یعنی وہ مقالہ جو نواب صدر یار جنگ بہادر نے سرسید ڈے کے موقع پر ۲۰ مارچ ۱۹۳۵ء کو مسلم یونیورسٹی کے ام پور حامد ہال (یونین ہال) میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جدوجہد کا ذکر نہایت دلچسپ اور محققانہ پیرایہ میں کیا گیا ہے قیمت ۱

ملنے کا پتہ محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ

فقہ حنفی | یعنی وہ رسالہ جس میں فقہ حنفی کی تاریخی حیثیت سے مورخانہ و محدثانہ
بحث ہے اور جس میں ضمناً حضرت ابوحنیفہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے دو نامور
شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمد اور بعض دیگر اساطین فقہ حنفی حضرت عبداللہ
ابن مسعود، علقمہ بن قیس، مسروق الہمدانی، اسود النخعی، عمر بن شرحبیل، شریح القاضی،
ابراہیم النخعی، حماد بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہم کے حالات سے بھی التفات ہے۔ قیمت ۴ر

آفتاب رسالت | جس میں سید آخر الزماں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی
مقدس زندگی کے حالات نہایت صحیح صحیح صاف اور سادہ
طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ رسالہ مسلمانوں کے مذہبی جلسوں اور مولود شریف کی
محفلوں میں پڑھے جانے کے لائق ہے۔ .. .. قیمت ۸ر

شان رسالت | یہ وہ تقریر ہے جو نواب صاحب ممدوح نے اپنے دارالریاست
حبیب گنج کی محفل میلاد مبارک میں بتاریخ ۱۱ ربیع الآخر
۱۳۵۳ھ ارشاد فرمائی اور جس میں قرآن شریف کے لفظ شاکلہ کی تفسیر بیان کرکے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے چند مراتب کو اس پر منطبق کیا ہے
جیسے رسالت، معراج، شفاعت، رفع ذکر وغیرہ وغیرہ .. قیمت ۲ر

رسالت عامہ | یہ بھی نواب صاحب ممدوح کی ایک تقریر ہے جو میلاد مبارک کے
جلسے میں کی گئی تھی اور جس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تاقیام قیامت تمام نسلوں، قوموں اور جماعتوں
کے لئے ہے۔ .. .. قیمت ۲ر

(ملنے کا پتہ محمد مقتدی خاں شروانی علی گڑھ)

استاذ العلماء

حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے سوانح۔ جن کے ضمن میں اُن کے اُستاذ مفتی عنایت احمد صاحب شہید اور استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب مرحوم کے کچھ مختصر حالات اور مفتی صاحب مرحوم کے اجل شاگردوں کے اسماء بھی شامل ہیں۔ اس رسالہ سے اچھا سے اچھا زمانہ کے اساتذہ اور تلامذہ کے طریق افادہ و استفادہ پر عمدہ روشنی پڑتی ہے تعلیم قدیم و جدید دونوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یکساں سبق آموز ہے .. .. قیمت ۳ر

تبصرہ

(ریویو) تاریخ خطیب بغدادی پر۔ یہ کتاب تاریخ اسلام کے متعلق نہایت معرکۃ الآرا کتاب ہے جو نایاب خیال کی جاتی تھی اور حال ہی میں چھپ کر آئی ہے۔ خود کتاب پر ریویو کے علاوہ مصنف (خطیب بغدادی) شہر بغداد، محمد بن اسحٰق صاحب سیرۃ، محمد بن جریر طبری، امام ابوحنیفہ اور اُن کی فقہا اور اساطین فقہ حنفی مثلاً حضرت علامہ امۃ عبداللہ ابن مسعود، علقمہ، اسود، شرحبیل، مسروق، شریح، ابراہیم، حماد، محمد، ابویوسف وغیرہم رضی اللہ عنہم اور فقہ حنفی پر نہایت دلچسپ اور مدلل و دل مقالے ہیں۔ .. .. قیمت ۵ر

خطبۂ افتتاحیہ

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ذی الحجہ ۱۳۳۳ھ از مولنا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ کہنے کو تو یہ کانفرنس کا خطبۂ صدارت ہے۔ لیکن جو کچھ کہ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اس کا ایک ایک لفظ عبرت و بصیرت کا باعث اور خواب غفلت سے بیدار کرنے والا ہے ضخامت ۲۰ صفحے۔ قیمت ایک آنہ ۱ر

ملنے کا پتہ محمد مقتدی خاں شروانی علی گڑھ

ذکر شریف
ایک مجلس میلاد کی تقریر جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک حالات اور مبارک عادات اور بطور نمونہ چند معجزات کا نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۲ر

پیغامِ رحمت
یوم النبی کے موقع کی تقریر جس میں بتایا گیا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے خدا کی طرف سے اُس کے بندوں کو توحید، امن، علم، مساوات، اخوت، حقوق، عدل، پارسائی، تقویٰ اور صفائی و پاکیزگی کے کیسے کیسے جاں پرور پیغام ملے ۔ ۔ ۔ قیمت ۴ر

اسلامی اخلاق
مضمون اخلاق پر دل نشین بحث کرنے کے بعد اچھے اور بُرے اخلاق کے متعلق کثیر التعداد حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے اور اخلاق جیسے خشک مضمون کو شگفتہ بنانے کی کام یاب کوشش کی ہے۔ بڑوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہے ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۸ر

عرضِ اخلاص
ایک تقریر جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں ضرور زمانہ کے مطابق ضرور عمدہ تعلیم پائیں۔ مگر اس طرح کہ شعائرِ اسلام پر نہایت استحکام کے ساتھ قائم رہیں اور سادہ اسلامی معاشرت ہاتھ سے نہ جانے دیں ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت ۲ر

تذکرہ بابر
ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھنے والے شاہ ظہیر الدین بابر غازی کے نہایت دل چسپ حالات جو اخلاقی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے نہایت دل چسپ اور قابلِ مطالعہ ہیں قیمت ۶ر

ملنے کا پتہ محمد مقتدی خاں شروانی علی گڑھ

خطبۂ صدارت

یعنی جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی سابق صدر الصدور امور مذہبی سرکار نظام کا خطبۂ صدارت جو ممدوح نے بحیثیت صدر اجلاس پراونشل کانفرنس صوبہ بمبئی بمقام پونا اگست ۱۹۱۸ء میں پڑھا۔ قیمت ۱/

خطبۂ صدارت شعبۂ اردو

۱۹۲۸ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا پانچواں اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب حسرت شروانی اس شعبہ کے صدر تھے۔ اس موقع پر آپ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ اس نے ہر طرف سے خراج تحسین وصول کیا۔ یہ خطبہ اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اس مختصر اشتہار میں یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ خطبہ کیا چیز ہے۔ مختصر یہ کہ مصنف کی مدت العمر کی واقفیت، ذوق سلیم، حسن مذاق و وسعت معلومات کا نتیجہ ہے، اور باعتبار جامعیت صحت، تاریخی واقعات، ایجاز و طرز بیان آپ اپنی مثال ہے۔ یہ ایسا خطبہ نہیں جو ایک بار پڑھ لینے یا سن لینے کے بعد بیکار ہو جائے بلکہ باقاعدہ سمجھ کر پڑھنے اور مطالعہ کرنے کی چیز ہے۔ چھپائی لکھائی نہایت عمدہ و نفیس کاغذ سفید و مضبوط قیمت صرف ۶/

حالات حزیں

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے مشہور نازک خیال شاعر علی حزیں پر ایک پر مغز لکچر دیا تھا، چونکہ بنارس حزیں کا مدفن ہے اس لئے یہ لکچر اور زیادہ دلچسپی سے سنا گیا، اس لکچر میں نہ صرف حزیں کے دلچسپ حالات بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس کی شاعرانہ حیثیت پر بحث کرکے منتخب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۳/

ملنے کا پتہ محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ

(ذیل کی تین کتابیں (۱) ذکر مبارک (۲) یادِ ایام اور (۳) گنجینۂ سلیمانی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی مصنفہ نہیں ہیں البتہ ممدوح کی پسند کردہ ہیں)

ذکر مبارک

یہ کتاب حضرت سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر مگر معتبر و مستند سوانح عمری ہے۔ باوجود اختصار کوئی ضروری بات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک کے متعلق ایسی نہیں ہے جو اس کتاب میں موجود نہ ہو۔ مثلاً حضورؐ کے خاندان ولادت، رضاعت اور ایام طفولیت کے واقعات لکھنے کے بعد زمانہ نبوت سے پہلے کے حالات بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد عہد نبوت اور مکہ معظمہ کے زمانہ قیام کے سبق آموز حالات اور کفار سے جو معاملات پیش آئے ان کا ذکر ہے۔ پھر ہجرت اور قیام مدینہ منورہ کے زمانہ کے حالات اور تمام لڑائیوں کا تذکرہ ہے اس کے بعد تمام ضروری حالات زمانہ وفات تک کے لکھے ہیں۔ اخیر میں ازواج مطہرات و اولاد کا مفصل تذکرہ اور پھر بہت خوبی کے ساتھ آپ کے تمام محاسن و اخلاق کا تذکرہ ہے۔ کتاب ۹۹ عنوانوں پر منقسم ہے۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال مرحومہ نے تین مرتبہ کتاب کو بغرض حصول ثواب شائع کیا۔ ایک ہزار جلدیں کانفرنس کو بغرض تقسیم عطا فرمائی تھیں جب اخبارات میں اعلان کیا گیا تو قریباً تین ہزار درخواستیں اس کی طلب میں آئیں جب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو مسلمانوں کی اس رجحان و شوق کا حال معلوم ہوا تو ممدوح نے بغرض حصولِ ثواب دو ہزار جلدیں اپنے صرف سے طبع کرائیں اور رفاہ عام کے خیال سے اس کی بہت کم قیمت رکھی ہے تاکہ ہر شخص آسانی سے اس کو خرید کر اپنے مولیٰ و آقا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاکیزہ حالات معلوم کر سکے۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ خوش حال مسلمان اس کی سیکڑوں جلدیں خرید کر مکتبوں، مسجدوں اور غریب مسلمانوں میں تقسیم کرکے ثواب دارین حاصل کریں۔ قیمت ۔۵/

ملنے کا پتہ محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ

یادِ ایام

مصنفہ جناب مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء جس کو فاضل مصنف نے جناب مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی خواہش پر تالیف فرمایا ہے۔ اس رسالہ میں عہد اسلامی میں صوبۂ گجرات کی علمی ترقی کی ولولہ انگیز تاریخ نہایت تحقیق و کاوش سے لکھی گئی ہے جس کے مطالعہ سے دورِ ماضی کا علمی مرقع ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ خطۂ گجرات بھی سلاطین اسلام کے زمانہ میں علم و فن کا ایک شاندار مرکز تھا۔ مصنّف کی تحقیقات و کاوش قابل ستائش ہے لکھائی چھپائی عمدہ قیمت بارہ آنے " " " " ۱۲/

گنجینۂ سلیمانی

شاہ آباد اودھ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے یہاں گزشتہ ایام میں ایک نہایت نامور طبیب پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اپنے کمال فن کی بدولت واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ سے خان بہادر معالج الدولہ کا خطاب پایا۔ اس کے بعد بھوپال میں بہت عروج حاصل کیا اور ریاست کے افسر الاطباء کے عہدہ پر ممتاز ہوئے۔ آپ کیا بہ لحاظ کمال فن طب اور کیا بہ لحاظ کیرکٹر غیر معمولی شخص تھے۔ اپنی زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ آپ کا دماغ خاص طور پر سیاسی واقع ہوا تھا جس سے آپ نے خوب کام لیا۔ اگر آپ یہ سب دلچسپ حالات معلوم کرنا چاہتے ہیں تو گنجینۂ سلیمانی کا مطالعہ کیجئے یہ کتاب حکیم صاحب یعنی معالج الدولہ خان بہادر حکیم سید فرزند علی صاحب افسر الاطباء کے ایک ہم وطن نے لکھی ہے جو تمام حالات سے واقف ہیں اور جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اپنے مصارف سے طبع کرائی ہے۔ لکھائی کاغذ سب چیزیں نہایت عمدہ ہیں قیمت نہایت کم رکھی گئی ہے تاکہ کتاب کی اشاعت زیادہ ہو اور لوگ فائدہ اٹھائیں۔ قیمت عہ

(ملنے کا پتہ محمد مقتدی خاں شروانی علی گڑھ)

شروانی بک ڈپو

بفضل خدا شروانی پرنٹنگ پریس کے ساتھ ایک بک ڈپو
بھی شروانی بک ڈپو کے نام سے قائم ہے جس میں اردو کے
نامور و مستند قدیم و جدید اہلِ قلم کی تصانیف موجود ہیں اور
بکفایت ہدیہ ہوتی ہیں اور معقول رقم کی خریداری پر مناسب
کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔ بڑوں، بچوں اور خواتین کے مطالعہ کے
لائق صرف سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق کی اپنی اور دیگر مطابع و
کتاب خانوں کی کتابیں رکھی جاتی ہیں۔ کتابوں کی فہرست
اور جملہ خط و کتابت کے لئے پتہ :

محمد مقتدیٰ خاں شروانی، علی گڑھ

بفضلِ خدا

شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں لو ہے

اور پتھر دونوں قسم کے چھاپوں میں عربی، فارسی،

اُردو، ہندی، انگریزی کا ہر قسم کا کام نہایت صحت

اور کفایت کے ساتھ ہوتا اور وقت پر دیا جاتا ہے

کتابوں کی فرمائش اور ہر قسم کی خط وکتابت

کے لئے پتہ :

محمد مقتدیٰ خاں شروانی علی گڑھ

ش ۳۷ ۹۳۲۶۹۷
(ن–ع ۱
۳۲۵۹۳

Date	No.	Date	No.
	1124		